عورت

ایک نفسیاتی مطالعہ

سیمون ڈی بوار

تلخیص و ترجمہ

کشور ناہید

سیمون ڈی بوار۔ پیرس میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئیں۔ سیمون نے ۱۹۲۹ء میں سوربونے سے فلسفے کی ڈگری حاصل کی اور یہاں وہ جین پال سارتر سے دُوسرے نمبر پہ رہیں۔ یہی امتحان ان کی دوستی کی خشتِ اوّل بنا۔ سیمون، وجودی تحریک کی ایک عظیم ناول نگار کے رُوپ میں ظاہر ہوئیں۔ ان کا پہلا ناول ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا، دُوسرا ۱۹۴۵ء میں تیسرا اور چوتھا ناول ۱۹۴۷ء میں دو سال بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں دو جلدوں میں "دی سیکنڈ سیکس" کتاب لکھی۔ ۱۹۵۴ء میں اگلا ناول چھپا۔ بعد ازاں ۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۹ء میں یکے بعد دیگرے خُوبصُورت اعلیٰ ادبی اقدار کے حامل ناول لکھے۔ ۱۹۷۸ء میں سیمون کو آسٹرین سٹیٹ انعام یورپ میں ان کی ادبی خدمات کے عوض دیا گیا۔

کشور ناہید، بلند شہر میں ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۶۹ء میں پہلا شعری مجموعہ "لبِ گویا" شائع ہوا۔ اس مجموعے پہ اُنھیں آدم جی ادبی انعام دیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں نظموں کا مجموعہ "بے نام مسافت" ۱۹۷۴ء میں عالمی اِنتخابِ نظم بعنوان "نظمیں" ترجمہ کر کے شائع کیا۔ ۱۹۷۷ء میں مجموعۂ کلیات "دُھوپ درانے" شائع ہُوا۔ ۱۹۸۱ء میں اگلا شعری مجموعہ "ملامتوں کے درمیان" شائع ہوا۔

نظموں اور غزل میں عورت کی بیداری اور مساوی آزادی کا خیال سربلند رہا۔ یہی خیال ایسی کتابوں اور تراجم کے مقام پہ لایا کہ سیمون کی کتاب "عورت" بھی تلخیص کی منزل پہ آئی۔ "باقی ماندہ خواب" کے نام سے مشہُور ادیبوں کے مضامین کتابی شکل میں زیرِ طبع ہیں۔

عورت

عورت

ایک نفسیاتی مطالعہ

سیمون ڈی بوار

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

تلخیص و ترجمہ
کشور ناہید

ویں گارڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ

دین گارڈ پبلیکیشنز نے پہلی دفعہ ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔

الائیڈ پریس مال روڈ لاہور نے چھاپا۔

ترتیب

حصہ اول

حصہ دوم

حصہ سوم

حصہ چہارم

میرے اور سیمون کے بیچ

سیمون کی زیرِ نظر کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت بھی اس کتاب کو دھماکے کے طور پر قبول کیا گیا اور آج بھی اس کتاب کی علمی، فنی اور سماجی حیثیت مسلمہ ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کتاب کی اشاعت پہ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی ماتھے پہ لکیریں مجتمع کرتے ہوئے، سیمون کو وجودی نظریۂ زندگی سے منحرف ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ تمام تضادات، محفوظات اور اختلافات کے باوجود، عورت کے معاشرے میں مقام، حیثیت اور اثرات کے نفسیاتی، علمی اور معاشرتی تناظر کے بارے میں یہ کتاب کلیدِ اوّل اور سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں "حقائق اور تصورات" تاریخ و توجیہہ کے پس منظر و پیش منظر میں بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں "عورت کی آج کی زندگی" زیرِ بحث لائی گئی ہے اور یہی دوسرا حصہ تلخیص کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ ضرورتِ تلخیص، اس لئے کہ سیمون نے بہت سی مثالیں فرانسیسی کلچر اور فرانسیسی

ادیبوں کے کرداروں کے تجزیے کی پابند کی ہیں۔ میں نے جرأت کرکے چند مثالیں شامل کی ہیں کہ جو پاکستانی کلچر اور صورتِ حال سے مماثل ہیں اور جو ہماری تہذیبی اشکال سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتیں ایسی مثالیں خارج از مطالعہ کردی ہیں۔ علاوہ ازیں سیمون نے بات کو ذہن نشین کرانے کے لئے ایک ہی بات کو بار بار مختلف نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ توجیہہ کا یہ انداز طوالت لئے ہوئے ہے۔ ہمارے قارئین اس طوالت سے اُکتا جاتے ہیں۔ اس لئے جو طرزِ استدلال ایک دفعہ اختیار ہوا۔ اُس کو دُہرانے سے گریز کیا گیا ہے۔

سیمون کی کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں اس کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ بتیس برس میں زندگی، معاشرت اور عورت نے بہت سے پیرہن بدلے ہیں۔ اس لئے کہیں کہیں تشنگیٔ تجربہ کا احساس ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی اُردو میں اس لہجے، متن اور مطالعہ کی پہلی کتاب ہونے کے باعث، ابتدائی سماجیات جاننے والوں کے لئے تو یہ کتاب۔ بارش کا پہلا قطرہ ہی ثابت ہوگی۔ ہاں جو افراد و خواتین، اس موضوع میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کو احساس ہوگا کہ سیمون "ورکنگ وومن" نہ ہونے کے باعث۔ موجود معاشرے کے بحرانوں اور پیچیدگیوں کو اُن کے صحیح تناظر میں نہیں رکھ سکی ہیں۔ وہ صاحبِ اولاد بھی نہیں۔ ہر چند کہ انہوں نے ایک لڑکی لے کر پالی۔ اسی لئے کئی جگہ وہ گھاؤ کہ جو پیٹ سے لے کر ہاتھوں جوان کی ہوئی اولاد لگاتی ہے اور اس کے اثرات، عورت کو جن گھٹناؤں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ کئی جگہ نظر نہیں آتے۔ ویسے بھی زمانہ گزشتہ تیس برسوں میں ایٹمی زمانہ ہونے کے باعث، عمودی اور اُفقی دونوں سطحوں پر نمایاں طور پر وسعت پذیر ہوا ہے۔ ایک اور بات کہ جس کے کہنے کا حق مجھے بھی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ سیمون ماہرِ نفسیات نہیں ہیں۔ جہاں کہیں انہوں نے محض نفسیاتی بوطیقا مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہیں تشنگی کا احساس حاوی رہ جاتا ہے۔ ان تمام کنارہ حرفیوں کے باوجود، یہ کتاب میری ابھی

میرے اور سیمون کے بیچ

سیمون کی زیرِ نظر کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت بھی اس کتاب کو دھماکے کے طور پر قبول کیا گیا اور آج بھی اس کتاب کی علمی، فنی اور سماجی حیثیت مسلمہ ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کتاب کی اشاعت پہ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی ماتھے پہ لکیریں مجتمع کرتے ہوئے، سیمون کو وجودی نظریۂ زندگی سے منحرف ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ تمام تضادات، محفوظات اور اختلافات کے باوجود، عورت کے معاشرے میں مقام، حیثیت اور اثرات کے نفسیاتی، علمی اور معاشرتی تناظر کے بارے میں یہ کتاب کلیدِ اوّل اور سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں "حقائق اور تصورات" تاریخ و توجیہہ کے پس منظر و پیش منظر میں بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں "عورت کی آج کی زندگی" زیرِ بحث لائی گئی ہے اور یہی دوسرا حصہ تلخیص کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ ضرورتِ تلخیص، اس لئے کہ سیمون نے بہت سی مثالیں فرانسیسی کلچر اور فرانسیسی

ادیبوں کے کرداروں کے تجزیے کی پابند کی ہیں۔ میں نے جرأت کر کے چند مثالیں شامل کی ہیں کہ جو پاکستانی کلچر اور صورتِ حال سے مماثل ہیں اور جو ہماری تہذیبی اشکال سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتیں ایسی مثالیں خارج از مطالعہ کر دی ہیں۔ علاوہ ازیں سیمون نے بات کو ذہن نشین کرانے کے لئے ایک ہی بات کو بار بار مختلف نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ توجیہہ کا یہ انداز طوالت لئے ہوئے ہے۔ ہمارے قارئین اس طوالت سے اُکتا جاتے ہیں۔ اس لئے جو طرزِ استدلال ایک دفعہ اختیار ہوا۔ اُس کو دُہرانے سے گریز کیا گیا ہے۔

سیمون کی کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں اس کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ بتیس برس میں زندگی، معاشرت اور عورت نے بہت سے پیرہن بدلے ہیں۔ اس لئے کہیں کہیں تشنگیٔ تجربہ کا احساس ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی اُردو میں اس لہجے، متن اور مطالعہ کی پہلی کتاب ہونے کے باعث، ابتدائی سماجیات جاننے والوں کے لئے تو یہ کتاب، بارش کا پہلا قطرہ ہی ثابت ہوگی۔ ہاں جو افراد و خواتین، اس موضوع میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کو احساس ہوگا کہ سیمون "ورکنگ وومن" نہ ہونے کے باعث، موجود معاشرے کے بحرانوں اور پیچیدگیوں کو اُن کے صحیح تناظر میں نہیں رکھ سکی ہیں۔ وہ صاحبِ اولاد بھی نہیں۔ ہر چند کہ انہوں نے ایک لڑکی لے کر پالی۔ اسی لئے کئی جگہ وہ گھاؤ کہ جو پیٹ سے لے کر پالی ہوئی جوان کی ہوئی اولاد لگاتی ہے اور اس کے اثرات، عورت کو جن گھٹناؤں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ کئی جگہ نظر نہیں آتے۔ ویسے بھی زمانہ گزشتہ تیس برسوں میں ایٹمی زمانہ ہونے کے باعث، عمودی اور اُفقی دونوں سطحوں پر نمایاں طور پر وسعت پذیر ہوا ہے۔ ایک اور بات کہ جس کے کہنے کا حق مجھے بھی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ سیمون ماہر نفسیات نہیں ہیں۔ جہاں کہیں انہوں نے محض نفسیاتی بوطیقا مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں تشنگی کا احساس حاوی رہ جاتا ہے۔ ان تمام کنارہ حرفیوں کے باوجود، یہ کتاب میری ایک

خود آگاہی اور خود شناسی کے لئے آئینہ صد اشکال ثابت ہوئی۔ میں یہ کتاب ترجمہ کرتی جاتی تھی اور یوں لگتا تھا۔ جیسے منظر کے راستے میں حائل پردے ہٹتے چلے جا رہے ہیں۔
پورا منظر کیا بنا۔ کتاب آپ کے سامنے ہے۔

کشور ناہید
۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء

rekhta

حصّہ اوّل

بچپن

عورت اس طرح پیدا نہیں ہوتی جس طرح بنا دی جاتی ہے۔ یہ ہماری سماجی معاشی نفسیاتی اور جسمانی ضروریات ہوتی ہیں جو کہ تہذیب و تمدن کے پردے میں مخنس اور مرد کے درمیان کی ایک شکل کو عورت کا نام دے دیتی ہیں۔ کسی کی شناخت ہی اس کا کردار متعین کرتی ہے۔ بچپن میں لڑکے لڑکیوں کو جب تک خاص طور پر واضح کر کے نہ سمجھایا جائے، اپنے آپ اس چیز کی اور صنف کے اختلاف کی تمیز نہیں ہوتی ہے۔ لڑکا ہو یا لڑکی، دونوں کی پرورش، ماں کے پیٹ میں یکساں ہوتی ہے، دونوں کی پیدائش کے وقت درد بھی ایک سا ہوتا ہے اور دونوں کی پرورش میں دودھ پینے اور اس سے لطف حاصل کرنے کا عمل بھی یکساں ہوتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے جسموں کی شناخت اور اس میں تبدیلیوں اور میلانات کو اپنی منفرد دلچسپیوں اور انہماک کے ساتھ لیتے ہیں۔ نئے بچے کی پیدائش پر پہلے کا حاسدانہ رویہ اظہار کرتا ہے اس بنیادی حس کا، کہ جو ایک بچہ اپنی کل خود اختیاری پر ضرب لگتی محسوس کرتا ہے۔ اس میں لڑکے، لڑکی کی تمیز نہیں کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ضد، پیشاب کرنا، رونا، چیخنا چلانا اور

بڑوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بچے کا خصوصی کردار، لڑکے لڑکی کی صنف کی تمیز کے بغیر یکساں ہوتا ہے، ۱۲ سال تک کی عمر تک، لڑکا اور لڑکی یکساں قوت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس وقت تک وہ برابر کی دماغی قوت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ ماہواری شروع ہونے اور بلوغت کی عمر کے صحیح وقت سے پہلے اگر لڑکی کو اُن سارے عوامل اور جنسی تلذذ کا احساس ہو تو یہ ماحول میں اور اس کے حلقے میں موجود، دوسرے لوگوں کے اثرات کے باعث ہو گا۔

جب ماں بچے کا دودھ چھڑاتی ہے تو کئی بچے بڑے شدید ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں[1]۔ یہ عمل چھ ماہ کی عمر میں عموماً کیا جاتا ہے۔ ردِ عمل کا احساس بچے میں چھ ماہ کی عمر سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد، بچہ اپنی جانب توجہ مبذول کرانے کی ہمت بھی رکھتا ہے اور مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ کبھی نقل اُتارتا ہے اور کبھی دیگر ارادی عوامل سے اپنی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔ یقیناً اس قسم کے عمل میں کوئی خاص منصوبہ بندی یا طریق فکر کارفرما نہیں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بچہ آئینے میں اپنا عکس شناخت کرنا شروع کر دیتا ہے، تب سے اس کا یہ عمل بھی شروع ہو جاتا ہے[2]۔ آئینے میں وہ اپنا عکس شناخت کرے یا نہ کرے، یہ بات تجربے میں آئی ہے کہ بچہ چھ ماہ کی عمر میں اپنے والدین کی نقل اُتارنا شروع کر دیتا ہے۔ یعنی وہ خارج کی دنیا سے اپنے رابطے کو استوار کرنا شروع کر دیتا ہے۔

جب بچہ ذرا اور بڑا ہوتا ہے۔ تو وہ جب ہمک کر اپنی ماں کے بازوؤں میں آتا ہے اور ماں کی آغوش کی چاہت کرتا ہے، تو گویا وہ خود کو محفوظ کرنے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔

---

[1] Judith Gautier نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ دودھ چھڑانے پر اس نے اتنے شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا تھا کہ ڈاکٹروں کے مشورے پر اس کی ماں کافی عرصے تک اپنا دودھ پلاتی رہی۔

[2] Dr. Lacan کا نظریہ بعنوان Les complexes familiaux dans la formation de p'individu

اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ محبت کے جوش میں اُسے لمحہ بھر میں دیوتا یا جن بنا کر مسحوریت کی حد تک چاہا جا سکتا ہے۔ یوں مسلسل چاہے جانے کی خواہش کا عمل لڑکے اور لڑکی میں تین یا چار سال کی عمر تک چلتا ہے۔

ساری دنیا میں بچے کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل مقبول ہے۔ سارے ماں باپ یہ متصور کرتے ہیں کہ بچہ نظر نہیں آ رہا اور بچہ خود کو سب سے چھپانے اور ماں باپ تھک کر ہار جانے کا ڈرامہ رچاتے ہیں۔ کچھ بچے ہیں کہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ میں تو دکھائی دے رہا ہوں۔ آپ جان بوجھ کر مجھے تلاش نہیں کر رہے۔ پھر اس کے بعد کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ لڑکی ہو تو سب کہتے ہیں۔ کیسی گڑیا سی لگ رہی ہے۔ کیسے پیارے بال بنے ہیں۔ کیسی پیاری چوڑیاں پہنے ہے۔ مگر لڑکا ہو تو کہیں گے ارے لڑکے ایسے نہیں سجا کرتے کیا بار بار لڑکیوں کی طرح آئینہ دیکھ رہے ہو۔ لڑکے تو نہیں رویا کرتے اور یوں ذرا سے بچے ہی میں مرد بننے اور خود کو حاکم اور خود عنان مرد کی حیثیت میں دیکھنے کی خواہش بیدار کر دی جاتی ہے۔

کچھ لڑکے، اس قدر آزادی اور اعتماد کی کھلی فضا سے گھبرا کر سوچنے لگتے ہیں کہ کاش وہ لڑکی ہوتے، اس طرح وہ لڑکے کہ جنہیں لڑکیوں کی طرح کپڑے پہنائے جاتے تھے، ان کو جب پتلون اور نیکر پہنائی گئی اور بال کاٹے گئے۔ وہ رونے لگے۔ بالکل ویسے ہی کہ جن لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح کپڑے پہنائے گئے انہیں جب لڑکیوں کے کپڑے دیئے گئے تو انہوں نے منہ بنایا اور اکثر نے تو لڑکیوں کے کپڑے پہنتے ہوئے شرم محسوس کی۔

بچوں میں عورت، مرد کے رویوں کی تخصیص، گھر کا ماحول کرتا ہے، عورتوں کی طرح باتیں کرنا" یا عورتیں کیا فیصلہ کریں گی۔" یا "عورت کی رائے بھلا کیا ہو گی"، "عورت کی طرح بکے جانا" قسم کے فقرے ہمارے گھروں میں عموماً اپنے طور پر مذاق کے انداز میں کہے جاتے ہیں۔ مگر یہی فقرے تربیتی رویوں کی بنیاد بنتے ہیں۔ غرور اور انا، مرد کے بنیادی خصائص

سمجھے جاتے ہیں۔ ایک لڑکا، اپنی بہنوں اور عم زاد بہنوں کی دیکھا دیکھی صرف بیٹھ کر اور لڑکیوں کی طرح پیشاب کیا کرتا تھا۔ اس کا باپ اُسے کہتا کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرو۔ مگر وہ ویسا ہی کرتا، جیسا وہ لڑکیوں کو کرتے دیکھتا۔ آخر کو ایک دن اس کے باپ نے کہا کہ آؤ میرے ساتھ اور میں جیسے پیشاب کروں تم بھی ویسے ہی کرو۔ تب لڑکے کو پتہ چلا کہ اس کے عضوِ بدن میں پیشاب کرنے کی قوت، لڑکی سے مختلف ہے اور اس علامت نے اُسے سب لڑکیوں سے خود کو افضل و برتر سمجھنے کی جانب ملتفت کر دیا۔

اس کے بالکل متضاد، لڑکی کو اس کے جنسی عضو کے بارے میں کچھ اس لئے نہیں بتایا جاتا کہ وہ تو سب کچھ اندر چھپا ہوتا ہے۔ لڑکی کو بس اُسے ایک پیشاب کرنے کی جگہ سمجھا کر جوان کیا جاتا ہے۔ یوں بچپن ہی میں بچے جب آپس میں جسمانی تقابل کرتے ہیں۔ تو لڑکی ظاہری جنسی عضو نہ ہونے کے باعث، احساسِ کمتری میں خود بخود مبتلا ہو جاتی ہے۔ کچھ نفسیات دانوں کا خیال ہے کہ لڑکیاں، جب چھوٹی عمر میں لڑکوں کی ٹانگوں کے درمیان ایک اضافی چیز لٹکی ہوئی دیکھتی ہیں[1] تو اس کا بہت مذاق اُڑاتیں اور اس کو عیب سمجھ کر چھیڑتی ہیں۔ اور کچھ چاہتی ہیں کہ ان کے بدن میں بھی اسی قسم کی چیز ٹانگوں کے بیچ نکل آئے کہ لڑکی اور لڑکا، خود کو برابر کا محسوس کریں۔

لڑکوں کے لئے پیشاب کرنے کا عمل، ایک کھیل کی طرح ہے۔ بچے عضوِ تناسل کو اُوپر نیچے کرتے ہوئے، گھماتے ہوئے، سکیڑتے ہوئے اور پکڑتے ہوئے پیشاب

---

[1] Freud, Adler, Karl Abrahaim, Karen Horney, Lampt De Grovt, Helen Deutch, A. Balint.

ان تمام ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ لڑکی کو واقعی اپنی جسمانی ساخت اور اندامِ نہانی کا صرف اتنا علم ہوتا ہے کہ ان کے کوئی سوراخ یا زخم ہے۔

اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ محبت کے جوش میں اُسے لمحہ بھر میں دیوتا یا جن بنا کر عورت کی حد تک چاہا جا سکتا ہے۔ یوں مسلسل چاہے جانے کی خواہش کا عمل لڑکے اور لڑکی میں تین یا چار سال کی عمر تک چلتا ہے۔

ساری دنیا میں بچے کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل مقبول ہے۔ سارے ماں باپ یہ متصور کرتے ہیں کہ بچہ نظر نہیں آ رہا اور بچہ خود کو سب سے چھپانے اور ماں باپ تھک کر ہار جانے کا ڈرامہ رچاتے ہیں۔ کچھ بچے ہیں کہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ میں تو دکھائی دے رہا ہوں۔ آپ جان بوجھ کر مجھے تلاش نہیں کر رہے۔ پھر اس کے بعد کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ لڑکی ہو تو سب کہتے ہیں۔ کیسی گڑیا سی لگ رہی ہے۔ کیسے پیارے بال بنے ہیں۔ کیسی پیاری چوڑیاں پہنے ہے۔ مگر لڑکا ہو تو کہیں گے ارے لڑکے ایسے نہیں سجا کرتے کیا بار بار لڑکیوں کی طرح آئینہ دیکھ رہے ہو۔ لڑکے تو نہیں رویا کرتے اور یوں ذرا سے بچے ہی میں مرد بننے اور خود کو حاکم اور خود عنان مرد کی حیثیت میں دیکھنے کی خواہش بیدار کر دی جاتی ہے۔

کچھ لڑکے، اس قدر آزادی اور اعتماد کی کھلی فضا سے گھبرا کر سوچنے لگتے ہیں کہ کاش وہ لڑکی ہوتے، اس طرح وہ لڑکے کہ جنہیں لڑکیوں کی طرح کپڑے پہنائے جاتے تھے، ان کو جب پتلون اور نیکر پہنائی گئی اور بال کاٹے گئے۔ وہ رونے لگے۔ بالکل ویسے ہی کہ جن لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح کپڑے پہنائے گئے، انہیں جب لڑکیوں کے کپڑے دیئے گئے تو انہوں نے منہ بنایا اور اکثر نے تو لڑکیوں کے کپڑے پہنتے ہوئے شرم محسوس کی۔

بچوں میں عورت، مرد کے رویوں کی تخصیص، گھر کا ماحول کرتا ہے، عورتوں کی طرح باتیں کرنا "عورتیں کیا فیصلہ کریں گی"۔ یا "عورت کی رائے بھلا کیا ہوگی"، "عورت کی طرح بکے جانا" قسم کے فقرے ہمارے گھروں میں عموماً اپنے طور پر مذاق کے انداز میں کہے جاتے ہیں۔ مگر یہی فقرے تربیتی رویوں کی بنیاد بنتے ہیں۔ غرور اور انا، مرد کے بنیادی خصائص

سمجھے جاتے ہیں۔ ایک لڑکا، اپنی بہنوں اور عم زاد بہنوں کی دیکھا دیکھی صرف بیٹھ کر اور لڑکیوں کی طرح پیشاب کیا کرتا تھا۔ اس کا باپ اُسے کہتا کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرو۔ مگر وہ ویسا ہی کرتا۔ جیسا وہ لڑکیوں کو کرتے دیکھتا۔ آخر کو ایک دن اس کے باپ نے کہا کہ آؤ میرے ساتھ اور میں جیسے پیشاب کروں تم بھی ویسے ہی کرو۔ تب لڑکے کو پتہ چلا کہ اس کے عضوِ بدن میں پیشاب کرنے کی قوت، لڑکی سے مختلف ہے اور اس علامت نے اُسے سب لڑکیوں سے خود کو افضل و برتر سمجھنے کی جانب ملتفت کر دیا۔

اس کے بالکل متضاد، لڑکی کو اس کے جنسی عضو کے بارے میں کچھ اس لئے نہیں بتایا جاتا کہ وہ تو سب کچھ اندر چھپا ہوتا ہے۔ لڑکی کو بس اُسے ایک پیشاب کرنے کی جگہ سمجھا کر جوان کیا جاتا ہے۔ یوں بچپن ہی میں بچے جب آپس میں جسمانی تقابل کرتے ہیں۔ تو لڑکی ظاہری جنسی عضو نہ ہونے کے باعث، احساسِ کمتری میں خود بخود مبتلا ہو جاتی ہے۔ کچھ نفسیات دانوں کا خیال ہے کہ لڑکیاں، جب چھوٹی عمر میں لڑکوں کی ٹانگوں کے درمیان ایک اضافی چیز لٹکی ہوئی دیکھتی ہیں[۱] تو اس کا بہت مذاق اُڑاتیں اور اس کو عیب سمجھ کر چھیڑتی ہیں۔ اور کچھ چاہتی ہیں کہ ان کے بدن میں بھی اسی قسم کی چیز ٹانگوں کے بیچ نکل آئے کہ لڑکی اور لڑکا، خود کو برابر کا محسوس کریں۔

لڑکوں کے لئے پیشاب کرنے کا عمل، ایک کھیل کی طرح ہے۔ بچے عضوِ تناسل کو اوپر نیچے کرتے ہوئے، گھماتے ہوئے، سکیڑتے ہوئے اور پکڑتے ہوئے پیشاب

---

[۱] Freud, Adler, Karl Abrahaim, Karen Horney, Lampt De Grovt, Helen Deutch, A. Balint.

ان تمام ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ لڑکی کو واقعی اپنی جسمانی ساخت اور اندامِ نہانی کا صرف اتنا علم ہوتا ہے کہ ان کے کوئی سوراخ یا زخم ہے۔

کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر دونوں طرح کرتے ہیں۔ جبکہ لڑکی کے لئے بیٹھ کر اور پردہ دار جگہ پر چھپ کر پیشاب کرنا لازم ہے چاہے وہ مغرب کا معاشرہ ہو کہ مشرق کا ہاں لڑکے کے ساتھ امتیازی سلوک ہو تو لڑکی اس کا سبب اس کے عضوِ تناسل کو سمجھتی ہے اور کچھ لڑکیاں تو اپنے آپ کو تسلی دینے کو یہ بھی کہدیتی ہیں کہ ان کے جسم میں بھی ایسی ہی قسم کی چیز چھپی ہے جو کبھی نہ کبھی ظاہر ہو ہی جائے گی۔ مگر لڑکا رعب جمانے کے لئے عضوِ تناسل کو پکڑ کر دکھانے، نمائش کرنے اور خود کو لڑکی سے بہتر بتانے کے لئے استعمال کرتا اور دکھاتا ہے۔ یوں عضوِ تناسل، قوت، جواں مردی اور احساسِ تفاخر کا استعارہ بن جاتا ہے۔ لڑکی کو اس محرومی سے ازالے کے لئے ایک گڑیا دے دی جاتی ہے۔ لڑکی کو اس سے بات کرنا کپڑے پہنانا، نہلانا، سلانا اور حتیٰ کہ مشرقی معاشرے میں گڑیا کی شادی کرنا بھی باقاعدہ سکھایا جاتا ہے۔ گڑیا پورے جسم کا استعارہ بنتی ہے اور پھر اس میں حرکت نہیں ہوتی۔ اس کو حرکت دلائی جاتی ہے۔ یوں لڑکی کو اپنے بدن اور اپنے کردار کی تربیت دی جاتی ہے۔ لڑکی جیسے جیسے بڑی ہوتی ہے۔ اس کو یہ باور کروایا جاتا ہے کہ اُسے ایک پینٹنگ کی طرح خوبصورت اور ایک پری یا شہزادی کی طرح باوقار لگنا چاہیے۔

لڑکے کو آزاد رہنے اور آزادی اختیار کرنے کی تربیت۔ سکول، گھر اور معاشرہ دیتا ہے درختوں پہ چڑھنا۔ دوسرے لڑکوں کے ساتھ لڑائی کرنا، ورزش کرنا۔ اپنے پٹھے مضبوط کرنے کے لئے بادام گھوٹ کر پینا، بوقتِ ضرورت گالی دینا اور فحش کلامی کرنا (اور اس فحش کلامی کو سن کر، عورت ذات کو ڈرانا کہ چپ کر اس وقت مرد غصے میں ہے۔ نجانے کیا کر بیٹھے) اس کو بچپن ہی میں چوٹیں کھانے، درد برداشت کرنے اور آنسو پی جانے کی تربیت دی جاتی ہے۔

جبکہ لڑکی کی ذات کو بطورِ فرد واحد نابود اور دوسروں کے کام آنے والی مشین اور پھرکنی میں ڈھلنے کی تربیت اور دوسروں کی رضا حاصل کرنے کا گُر سیکھنے والی چابی کی گڑیا سمجھا جائے۔

اس کو گڑیا کی طرح رکھا، سنبھالا اور پہنایا جاتا ہے۔ لڑکی کی آزادی بالا علان نام لے کر بند کی جاتی ہے۔ اگر اس کو بھی آزادی دی جائے تو یقیناً اس میں بھی وہی ہمت اور وہی حوصلہ مندی آسکتی ہے جو ایک لڑکے میں ہے اور تجربات نے یہ ثابت بھی کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر لڑکی کو پینٹ اور بوشرٹ چار پانچ سال کی عمر میں بھی پہنائے جائیں تو کوئی اور نہیں تو ہم عمر لڑکے لڑکیاں ہی اس کی جان یہ سوال پوچھ پوچھ کر ہی عذاب میں ڈال دیتے ہیں کہ تم لڑکی ہو کہ لڑکا۔ کچھ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ چونکہ بچوں کی تربیت ماں کے ہاتھوں میں کلی طور پر دے دی جاتی۔ اس لئے مائیں، لڑکوں کو مرعوبیت میں اور لڑکی کو بطور ثانوی عکس کے تربیت دیتی ہیں۔ لڑکی کو کھانا پکانے، گھر بار سنبھالنے، مرد کو قابو میں رکھنے کے گُر آنے بہانے، بڑی بوڑھیاں، بچپن ہی سے سکھانا شروع کر دیتی ہیں۔ اگر لڑکی بالکل سیدھی چلے تو ڈانٹا جاتا ہے کہ کیا اونٹ کی طرح چل رہی ہو۔ جھک کر چلو کہ سینے کا ابھار ظاہر نہ ہو۔ لڑکا جھک کر چلے تو کہا جاتا ہے۔ کیا لڑکی کی طرح چل رہے ہو۔ سیدھے ہو کر سر اٹھا کر چلنا سیکھو۔ آج کل ترقی کے باوجود، ابھی تک پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں یہ بحث جاری ہے کہ یہ کام لڑکی کر سکتی ہے کہ نہیں ہاکی اور کرکٹ مردوں کے کھیل ہیں کہ لڑکیاں بھی کھیل سکتی ہیں اور پھر اگر وہ اچھی کھلاڑی، اچھی ٹیچر، اچھی مقرر یا اچھی ادیبہ بن بھی جائے اور مانی بھی جاتے تو پھر بھی معاشرہ اس سے ایک اچھی ماں، اچھی عورت اور اچھی بیوی ہونے کا مطالبہ اولاً کرتا ہے۔

لڑکی گڑیا کو اپنی ساتھی اور اپنی اولاد، دونوں حیثیتوں میں دیکھ کر دونوں رویے اختیار کرتی ہے۔ وہ اپنی ماں کی طرح گڑیا کو ڈانٹتی بھی ہے اور اپنی ماں کو ہمسائی اور بہن کے ساتھ کام کرتے اور دکھ سکھ کرتے دیکھ کر، وہ بھی وہی لہجہ اختیار کرتی ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں لڑکی بچپن ہی میں گڑیا کھیلنے سے اس خیال کو حقیقت اور کردار میں ڈھال لیتی ہے کہ بچے کی تربیت صرف اور خالصتاً ماں کا فریضہ ہوتا ہے۔ پھر جو ادب ملتا ہے۔ جو

تقریر سننے کو ملتی ہے۔ جو ڈرامے دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں اور جو فلمیں دکھاتی ہیں۔ وہ بس یہی ہیں کہ وہ ایک گڑیا ہے جو بیاہنے پہ ماں بن کر بچے پالتی ہے۔

اب جبکہ لڑکی کو اس کی تقدیر، بچے پالنا باور کرا دی جاتی ہے تو پھر وہ اس بات پر اعتبار کرنا بھی چھوڑ دیتی ہے کہ بچے آسمان سے آتے ہیں یا پھر کوڑے کے ڈھیر پہ پڑے مل جاتے ہیں، یا ڈاکٹر تھیلے میں لا کر ان کے گھر چھوڑ جاتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے سے بعد کے بچوں کی پیدائش پر باقاعدہ نظر رکھتے ہوئے۔ بغیر پوچھے بھی یہ یقین کر لیتی ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں بڑا ہوتا ہے۔ اس وقت لڑکی، خوف کی علامت کے طور پر کم اور تجسس اور دلچسپی کی علامت کے طور پر ماں کے پیٹ کے بڑھنے اور پھر نارمل ہونے کے عمل کو محسوس کرتی ہے۔ اس وقت تک لڑکی، اس عمل میں باپ کے کردار اور شراکت کے فعل سے ناواقف ہوتی ہے اور سمجھتی ہے کہ عورت کسی خاص قسم کا کھانا کھانے سے حاملہ ہو جاتی ہے اور پیٹ زیادہ خراب ہو یا پیٹ میں درد ہو تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بچیاں نقل اُتارتے ہوئے، اپنے پیٹ پہ تکیہ باندھ کر یا چادر موٹی کر کے باندھ کر، اُسی طرح چلتی ہیں۔ جیسے ان کی حاملہ مائیں چلتی ہیں۔ بہت سی بچیاں، ماؤں کو دیکھ کر، اپنی گڑیوں کو بھی دودھ پلانے بیٹھ جاتی ہیں۔ لڑکیوں کی طرح لڑکے بھی، ماؤں کے حاملہ ہونے پہ حیرت زدہ ہوتے ہیں۔ مگر لڑکی کی طرح خود کو اس صورتِ حال میں منطبق نہیں کر سکتے ہیں۔

لڑکیوں کو خصوصاً بڑی لڑکی کو ماں کی مدد کرنے، آلو چھیلنے، صفائی کرنے، برتن دھونے، مسالحہ پیسنے، گویا گھر کے کام کاج کے ذریعہ اپنی نسوانی حیثیت کو بنانے کا تصور مستحکم کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب تک وہ جوان ہو۔ اُسے اپنی حدود، اپنی ذاتی کم مائیگی اور معاشرے میں ثانویت کا پوری طرح احساس کروایا جا چکا ہوتا ہے۔ دادا، دادی اور نانی۔ لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں جس طرح ترجیح دیتے اور لڑکے کی پیدائش پر جس طرح خوش ہوتے ہیں۔ یہ ساری علامتیں، لڑکی کو اپنے وجود میں مضمر بوجھ کو باور کراتی ہیں۔

والدین کے تجزیے میں لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمتی کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔

لڑکی بڑی ہوتی ہے تو محسوس کرتی ہے کہ ہر چند روزمرہ کے معمولات، ماں کے دائرۂ اختیار میں ہوتے ہیں۔ مگر ان سب روزمرہ معمولات کے گرد ایک حصار ہوتا ہے اور وہ حصار ہوتا ہے، باپ کے حکم، باپ کی خواہش اور باپ کی توقعات کا کہ جن کا حصول ماں کو دن رات کارکردگی، رکھ رکھاؤ اور باپ کے سامنے مودبانہ پیش ہونے کے لئے تیار کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ باپ کی گھر سے باہر کی غیر ضروری اور اضافی مصروفیت اور گھر سے باہر دلچسپی کو بھی بڑی عزت توقیر اور رازداری سے پرکھا اور دیکھا جاتا ہے۔ وہ گھر آتا ہے تو گویا باہر کی دنیا ختم کر کے، واپس پلٹتا ہے۔ وہ گھر کا خدا ہوتا ہے اور بچے کو بھی باپ کی آمد کے لئے مجسم انتظار بننے کی تربیت دی جاتی ہے۔ جبکہ لڑکا، اپنے باپ کی رعونت اور خود اختیاری کو رقابت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر باپ، لڑکی کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہے تو وہ لڑکی کی محبت اور توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ لیکن باپ کی بے توجہی لڑکی کو باپ سے متنفر بھی بہت جلد کرا دیتی ہے۔ بالکل اس طرح کہ مرد کے ساتھ دیگر گھر اور معاشرے میں موجود خواتین کا ردِ عمل، جوان ہونے والی لڑکی کے لئے تربیت گاہ کا درجہ رکھتا ہے۔

ماں پر باپ کے مقابلے میں اور اسی طرح لڑکی پر مذہب کی فوقیت کا بھی اثر ہوتا ہے۔ کسی خاص مذہب کے حوالے سے مبرا ہو کر دیکھا جائے تو خدا اور فرشتے، کسی خاص صنف کے حوالے سے شناخت نہ ہونے کے باوجود، مرد کی صفات و عادات کے علاوہ تذکیر کے حوالے سے بلائے اور پہچانے جاتے ہیں۔ بعدازاں مذہبی رہنما ہونے کا اعزاز، صرف مرد نے اپنے لئے محدود رکھا ہے۔ کہانی دیکھو تو عورت "سلیپنگ بیوٹی"[1] ہے۔ سنڈریلا ہے، سیتا ہے۔ شیریں ہے کہ جو اپنے عاشق کا انتظار کرتے کرتے۔ دم توڑ دیتی ہیں۔ مختصر

---

1. Sleeping Beauty

یہ کہ عورت کی کل کائنات اور پوری قوت، مرد کو پرچانے پہ صرف ہوتی ہے۔ گھرداری کو بزدلی میں منتقل کرنے کا دوسرا نام نسوانیت قرار پاتا ہے۔ ہمارے گھروں کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ نو دس سال کی لڑکی کوشش کرتی ہے کہ بے شک کہیں سے پیڈ رکھ کر ہی وہ اپنا سینہ پھلا سکے اور کولہے بھر سکے۔ اسی زمانے میں قریبی دوستی کی ضرورت بھی محسوس کی جاتی ہے۔ ایک دوسرے سے جنسی معلومات اور استفسارات پر بات چیت کرنا کہ ہمارے ادب میں تو اس کے بارے میں کوئی سائنسی کتاب موجود ہی نہیں ہے۔ پھر لڑکیوں کا اکٹھے ہو کر لڑکوں کا مذاق اُڑانے کا عمل اور بالکل اسی طرح لڑکوں کا لڑکیوں کو چھیڑنے کا فعل، ایک دوسرے کی سمت قدرتی طور پر ملتفت محسوس کرنے کا براہِ راست ردِ عمل ہے۔ لیکن اسی طرزِ عمل میں اگر مساوات اور برابری کے سلوک کی آنچ کارفرما نظر آئے تو لڑکی، اپنے وجود کو قابلِ عزت اور قابلِ افتخار سمجھنے لگتی ہے[1]۔ ایک تجربے سے پتہ چلا کہ سو میں سے صرف ایک لڑکا، لڑکی بننے کو ترجیح دیتا ہے، جبکہ لڑکیوں میں سے ۵۰ فیصد لڑکیاں لڑکا بننا پسند کرتی ہیں۔ وجہ یہ بیان کرتی ہیں "لڑکوں کو، لڑکیوں کی طرح مصیبتیں نہیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ لڑکے کو پڑھائی کے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔ لڑکے زیادہ، آزاد ہوتے ہیں۔ ان کو ہر وقت ڈھنگ سے کپڑے پہننے کی تلقین نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ"

ماحول کی کثافت اور گھر کی سختیوں سے گریز کی شکل، سستے، جذباتی ناولوں کے پڑھنے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اب لڑکی خود کو اسی جذباتی ناول کی ہیروئن بھی سمجھ کر خود خیالی کی دنیا میں سفر شروع کر دیتی ہے۔ وہ کبھی کبھی تو اس حد تک جذباتی ہو جاتی ہے کہ محض ناول کے جذباتی منظر نامے سے اس کو جنسی ابھار اور پھر آسودگی بھی مل جاتی ہے۔ وہ ٹریجڈی سین پڑھ کر بالکل کردار کی ضرورت کے مطابق خوب روتی بھی ہے کچھ لڑکیاں تو خود کو کھڑے

---

[1] سوئٹزرلینڈ میں صرف ایک سکول ہے جہاں لڑکے لڑکیاں مکمل آزادی اور اطمینان کے ساتھ مساوی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور دیکھنے والے ان کو مطمئن بھی پاتے ہیں۔

ہو کر آئینے میں روتے ہوئے دیکھنے میں بھی سکون اور دل کا ہلکا ہونا محسوس کرتی ہیں۔
یہ بھی ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو جو محرومیاں یا مایوسیاں مقدر ہوتی جاتی ہیں۔ لڑکی
ان سب کو باقاعدہ نوٹ کرتے ہوئے، یہ عہد بھی کرتی ہے کہ میں اپنی اولاد اور اپنے بچوں
کے ساتھ یہ بدسلوکی اور یہ حق تلفی نہیں ہونے دوں گی۔ ایک اور مسئلہ جو بچوں کو مسائل اور
تضاد سے دوچار کرتا ہے وہ یہ کہ عضوئے تناسل سے لے کر، ہر وہ عمل جو اس سے متعلق
ہو یعنی پیشاب کرنے، اُسے ہاتھ لگانے یا کسی کے سامنے ظاہر کرنے کو بے شرمی اور گندے پن
سے یاد کیا جاتا ہے۔ بچے کے ذہن میں یہ تضاد اُبھرتا ہے کہ اگر یہ عمل گندہ ہے۔ تو پھر بڑے
کیوں کرتے ہیں۔ بلکہ کچھ بچے تو دوسرے بچوں سے اس جنسی عمل کی تفصیل سن کر غصے سے چیخ
اُٹھتے ہیں "میرے والدین ایسا گندہ کام نہیں کرتے۔ وہ گندے آدمی نہیں ہیں"۔ پھر جب وہ اور
زیادہ پڑھتی اور ذرا زیادہ سمجھدار ہوتی ہے تو ایک اور سوال اس کو گھیر لیتا ہے۔ "جنسی عمل زیادہ
لطف خیز ہوتا ہے" کہ "تکلیف دہ" یہ کتنی دیر جاری رہتا ہے۔ "چند منٹ" کہ "ساری رات"
یہ بھی اس کے پڑھنے میں آتا ہے کہ عورت صرف ایک بغل گیری کے بعد، حاملہ ہو گئی۔ یہ
بھی سننے میں آتا ہے کہ وہ گھنٹوں کے جنسی اختلاط کے باوجود، ساکت اور برف رہی پھر
ان کے ذہن میں سوال اُٹھتا ہے کہ کیا جنسی عمل روز کیا جاتا ہے یا کبھی کبھی کچھ لڑکیوں نے
جنسی علم و تعلیم کے بارے میں کیا جواب دیئے، درج ذیل ہیں:۔

"مجھے کسی نے جنس اور اس کے عوامل کے بارے میں نہیں بتایا۔ نہ میری ماں
نہ میری سکول ٹیچر نے اور نہ ہی مجھے کوئی ایسی کتاب ملی کہ جس میں اس موضوع
پر سیر حاصل بحث کی گئی ہو۔ میں عجیب و غریب مخمصے میں گرفتار تھی جو کہ
مجھے بیک وقت قدرتی عمل بھی لگتا تھا۔ مجھ سے بڑی لڑکیاں ایک دوسرے
کو جنس کے حوالے سے چھیڑتی بھی تھیں۔ مجھے پندرہ سال کی عمر میں ماہواری آنی
شروع ہوئی۔ یہ بھی میرے لئے اچنبھا تھا۔ آخر کو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی

اور میری جذباتی غیر یقینی کی کیفیت ختم ہوئی۔ مگر میں سخت ناخوش تھی۔ اتنی دقتوں اور اتنی مصیبتوں کے بعد یہ پتہ چلا تھا کہ جنسیت اور برہنگی مل کر آپ کی محبت بنتی ہیں پہلے ماں سے پوچھا۔ جواب تھا۔ بچہ ماں کے پیٹ میں بنتا ہے اور پیٹ کاٹ کر بچہ نکالا جاتا ہے۔ استاد سے پوچھا تو انہوں نے ماہواری کا تھوڑا سا حوالہ دیا، باپ سے پوچھا تو انہوں نے جانوروں کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ آخر کو میں نے ایک میڈیکل انسائیکلو پیڈیا دیکھا اور کچھ حیرت اور کچھ علم سے میری الجھن دور ہوئی"۔

"آٹھ سال کی عمر میں میں اپنے ایک ہم عمر لڑکے سے ملی اور بتایا کہ ماں کے اندر بہت سے بچے پیدا کرنے والے انڈے ہوتے ہیں اور جب ماں چاہتی ہے تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نے یہ سن کر مجھے بُرا بھلا اور بے وقوف کہا اور بتایا کہ جب قصائی اور اس کی بیوی نے بے ہودہ سی حرکتیں کیں تو اس کے بعد ان کے یہاں بچہ ہوا تھا۔ مجھے اس کی اس بات پر اعتبار نہ آیا۔ جب میں ساڑھے بارہ برس کی ہوئی تو مجھے اپنی نوکرانی کی عجیب و غریب حرکات کا پتہ چلا۔ مگر میں نے ڈر اور شرم کے مارے اپنی ماں سے کچھ نہ کہا۔ مگر جب ایک دفعہ میں نے اُسی نوکرانی سے پوچھا کہ کیا مردوں کے گھٹنوں پہ بیٹھنے سے بچہ ہو جاتا ہے۔ تو اُس نے مجھے بے وقوف کہہ کر، بعد میں ساری بات تفصیل سے سمجھائی۔

"میں نے سکول میں یہ چیز جان لی کہ بچے کہاں سے آتے ہیں۔ یہ کافی خوفناک سی چیز معلوم ہوتی۔ مگر ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا کہ بچے دنیا میں کیسے آتے ہیں۔ ہم لڑکیوں نے اپنے ذہن میں اس کا بڑا ہولناک منظر باندھا۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ ایک دن صبح صبح ایک ویران سی سڑک پر ہمیں ایک آدمی ملا اور اُس نے ہمیں اپنا عضوِ تناسل دکھاتے ہوئے کہا کہ کیا تم اس سے کھیلنا چاہو گی۔ ہمیں اس سے بہت خوف آیا اور ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں جب تک ۱۲ سال کی نہیں ہوئی یہ سمجھتی رہی کہ بچے ناف کی جگہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں"۔

"ایک اور لڑکی سے میں نے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے، بچّے کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ لڑکی نے بڑی بددلی سے کہا کہ بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے، مگر ماں کو بچہ پیدا کرنے کے لئے باپ کے ساتھ بڑی بدتمیزی کا کام کرنا پڑتا ہے اور پھر اس نے اس بدتمیزی کی تفصیل مجھے بتائی اور کہا کہ میرے سو جانے کے بعد میرے والدین یہ بری بری حرکتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو انہیں اپنے والدین کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر بچے کو بالکل وضاحت سے بھی یہ عمل سمجھانے کی کوشش کی جائے، تب بھی بات بنتی معلوم نہیں ہوتی ہے کہ صرف لفظوں میں جنس اور جنسی جذبات کو پیش کر کے، کسی منطقی دلیل پر پہنچا جا سکے۔ یہ تو صرف خود عملی زندگی کرنے اور اس عمل سے گزرنے کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اکھوے سے، غنچہ، شگوفہ اور پھول بننے کی داستان ایک دن کے بچے سے مرد بننے کی داستان کی طرح وضاحت سے بیان کی جا سکتی ہے۔ مگر جنسی لذت اور عشق و محبت کی وارفتگی کو لفظوں اور منطق کے ذریعہ بچے کو سمجھایا نہیں جا سکتا ہے۔

اب آپ ہی سوچیں کہ بوسے کی جنسی حیثیت اور لذت کو بچّے کو کیسے سمجھایا جائے۔ یہ تو بالکل اسی طرح ہے کہ جیسے ایک اندھے کے سامنے، رنگوں کی وضاحتیں کرتے رہو۔ جب تک بچے میں جنسی لذت اور حس جاگ نہیں اٹھتی۔ ان چیزوں کی وضاحت اور معنویت اس پر اثر نہیں کرے گی۔ اگر کسی ناکتخدہ لڑکی کو یہ بتا دیا جائے کہ وہ لڑکی سے عورت صرف اس شکل میں بن سکتی ہے کہ جب اس کے اندر مرد کا عضوِ تناسل داخل ہو، تو یہ بات اس کے لئے پریشان کن بھی ہوتی ہے اور خوفناک بھی، عضوِ تناسل کی نمائش، دانستہ و نادانستہ، مرد کرتا ہی رہتا ہے۔ اس لئے ہر لڑکی نے اس کو دیکھا تو ہوتا ہی ہے اور اگر نہیں تو کسی لڑکی نے بیل، گھوڑے، کتے وغیرہ کا عضوِ تناسل تو بہرحال اکڑی ہوئی شکل میں دیکھا ہی ہوتا ہے

اور اس سے نفرت بھی کی ہوتی ہے۔ اس لئے خوف اور بچے کی پیدائش کی دہشت، عورت کی چیخوں کی آواز اور پھر باپ کی ماں سے بد سلوکی، یہ بہت سے رویے مل کر لڑکی کو بچپن ہی میں یہ کہدینے پہ مجبور کر دیتے ہیں کہ میری توبہ، میں کبھی بھی شادی نہیں کروں گی۔ بے شرمی، بے وقوفی، تکلیف اور اخلاقی تضاد کو ناقابلِ عبور، واقعہ سمجھتے ہوئے یہ بیان بعید از قیاس بھی نہیں۔ لاروے کا تتلی میں تبدیل ہونے کا عمل بچے کو پریشان اور حیران کر دیتا ہے۔

سنِ بلوغت میں قدم رکھتے ہوئے، لڑکی کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے اندر اور اس کے ارد گرد کی دنیا میں چیزوں کے معانی اور اشارے بدل رہے ہیں۔ لمس، ذائقہ، خوشبو، خواہش، ہر لفظ کے پیرہن اس کے سامنے بدل رہے ہیں۔ اب تو وہ خود کو بھی آئینے میں پہچاننے میں دقت محسوس کرتی ہے۔ اس وقت بچی سے عورت کے بدن کی سمت سفر، لڑکی کے جسم پر گوشت چڑھنا، عجیب و غریب کیفیات لے کر آتا ہے۔ بارہ سے پندرہ سال کی عمر کے درمیان ماہواری شروع ہو جاتی ہے۔ لڑکی میں یہ بے آرامی، گندگی اور اس کو چھپائے رکھ کر نارمل ظاہر کرنے کی متضاد کیفیت، لڑکے سے پہلے ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایک طرف پستان بڑھنا شروع ہوتے ہیں۔ جسم پر بال آنے لگتے ہیں۔ اب لڑکی نہ کسی کے سامنے ننگی ہو سکتی ہے، نہ بتا سکتی ہے۔ اس میں خود بخود شرمانے اور اپنے آپ کو چھپانے کی خواہش اُبھر آتی ہے۔ وہ اپنی بہنوں اور ماں سے بھی شرماتی ہے اور اکیلے میں تو کبھی آئینے کے سامنے نپل بنتے ہوئے اور اس کے گرد سیاہ، حاشیہ اُبھرتے ہوئے دیکھ کر حیران بھی ہوتی ہے۔ نپل کی سختی بھی اس کو پریشان اور حیران کرتی ہے کہ یہ کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔ کچھ لڑکیاں اور مائیں، بڑھتے ہوئے پستانوں کو چھپانے کے لئے لڑکی کے سینے پہ کس کر دوپٹہ یا رومال باندھ دیتی ہیں کہ لڑکی کے بڑھے ہوئے پستان کنوارپنے اور نسوانیت کی علامت نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ ایک عورت نے بتایا کہ جب وہ ابھی تیرہ سال ہی کی تھی تو سڑک پر نیکر

پہننے لاپرواہی سے جارہی تھی کہ ایک مرد نے اس کی ٹانگوں کے بالوں کی سمت بڑی بری طرح اشارہ کیا اور ہاتھ لگانے کی بھی کوشش کی۔ اس نے ماں کو بتایا اور ماں نے اسی دن سے اُسے لمبی قمیض، جرابیں اور پینٹ پہنانی شروع کی۔ لڑکی کے بدن میں تبدیلی صرف لڑکی کو حیران نہیں کرتی بلکہ اُسے اپنے بدن سے الگ اور خارج کی دنیا کو اپنے سے متعلق کرنے اور اس خیال کی جانب منعطف کرنے میں کامیاب ہوتی ہے کہ ساری دنیا اس کے بدن کی تبدیلی کو نوٹ کررہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کہیں سے سلیمانی ٹوپی ملے اور وہ اوڑھ کر ساری دنیا سے روپوش ہو جائے۔

اس رویے کو بہت سی لڑکیاں، پتلی اور کمزور رہ کر، ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کچھ کھاتی نہیں۔ انہیں مجبور کیا جاتے تو وہ اُلٹیاں کرنے لگتی ہیں۔ وہ اپنے وزن پر مسلسل نظر رکھتی ہیں۔ کچھ لڑکیاں بزدل اس قدر ہو جاتی ہیں کہ وہ کسی کے سامنے نکلنا، ڈرائنگ روم میں آنا یا گلی میں نکلنا تک معیوب سمجھتی ہیں۔ اکثر ماؤں کا رویہ بھی لڑکیوں میں احساسِ شرم کو بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ ایک عورت نے کہا تھا کہ :۔

"مجھے گھر میں بات بات پہ اپنے بڑھتے ہوئے جسم کی شرم کرنے اور ڈھکنے کا احساس دلایا جاتا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں احساسِ کمتری ہو گیا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا کہ مجھے اپنے پیر بھی چھپانے چاہئیں، احساسِ شرم بڑھتے بڑھتے، احساسِ کمتری اور بزدلی بن جاتا ہے۔"

کچھ لڑکیاں اپنے بدن کی تبدیلی کو احساسِ فخر کے ساتھ قبول کرتی ہیں۔ مگر جیسے ہی ماہواری شروع ہوتی ہے۔ چونکہ انہیں اس کے بارے میں پہلے سے بتایا نہیں جاتا۔ لڑکیاں خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔ اکثر مائیں جان بوجھ کر، لڑکی کو دوسرے عوامل بتانے کے باوجود ماہواری کے بارے میں کچھ اس لئے نہیں بتاتی ہیں کہ وہ خود اس جھمیلے سے اکتائی ہوئی اور گھبرائی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ وقت پڑنے سے پہلے ہی ان کی اولاد ایک ایسے خوف سے دوچار ہو جائے کہ جس کا مداوا بھی ان کے پاس نہیں ہے۔

جیسے ہی ماہواری شروع ہوتی ہے، لڑکی سمجھتی ہے کہ یا تو اس کے بدن میں کوئی پھوڑا تھا جو پھوٹ بہا ہے، یا کوئی زخم ہو گیا ہے، یا پھر اس سے کوئی ایسی شدید غلطی ہوئی ہے کہ جس کا اُسے علم نہیں۔ ایک اعداد و شمار کے مطابق ۱۲۵ شاگردوں میں سے ۳۶ کو تو بالکل اس کا کچھ علم تھا ہی نہیں، ۳۹ کو تھوڑا بہت اندازہ سا تھا۔ اسی طرح ماہواری کے شروع ہونے پر خودکشی کی کوششیں بھی نوٹس میں آئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک دم خون کا جاری ہو جانا، پریشان کن بات ہے، ویسے بھی یہ خدشہ کہ کہیں کوئی اندرونی زخم پھٹ پڑا ہے، یا پھر جسم سے خون نکلتا رہا تو کب تک نکلے گا اور یوں خود بخود موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ اس خوف اور چھپانے کے دُھرے عمل میں لڑکی، گھبرا گھبرا کر جلدی جلدی غسل خانے جاتی، خون سے بھری شلواریں چھپاتی اور عجیب و غریب حرکتیں کرتی نظر آتی ہے۔ میری ایک دوست کہ جس کی ماں مر چکی تھی۔ تین ماہ تک اپنی آپا اور اپنے باپ سے گندے انڈر ویئر اور کپڑے چھپاتی رہی، یہی سوچ کر کہ اس دفعہ تو کچھ ہو گیا ہے، شاید اب پھر نہ ہو۔ اسی طرح دیہاتی عورتیں کہ جن کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ جانوروں کی پیدائش کا عمل چونکہ عموماً ان کے سامنے ہی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ہر قسم کے ایسے اندیشوں سے آزاد ہوں گی، غلط خیال معلوم ہوتا ہے کہ ماہواری کا آغاز، دیہاتوں میں بھی اسی دہشت اور خوف کے ردِ عمل کے ساتھ ہوتا ہے۔

ماہواری کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے، مرد کے بارے میں بھی ایسی معلومات دی جاتی ہیں کہ بس مرد کا ہاتھ لگا نہیں۔ اس کے جسم سے لڑکی کا جسم ملا نہیں اور فوراً حمل ٹھہر گیا۔ واقعتاً یہ باتیں بڑھا کر اس لئے بتائی جاتی ہیں کہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان ایک حدِ فاصل رہے۔ پھر لڑکی کو اندازہ ہوتا ہے کہ ماہواری شروع ہونے سے گویا اس کی بدقسمتی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کو فائدہ تو کوئی ہوتا نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہر مہینے اس کو گندگی برداشت کرنی پڑتی ہے، بلکہ جن رشتہ داروں کو پتہ چل جاتے وہ اس کا مذاق اُڑانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ بہت سے گھروں میں غربت کے باعث پھٹی ہوئی قمیض، چادریں، دسترخوان صرف اسی مقصد کے لئے سنبھال کر رکھے جاتے ہیں اور

آزار بند سے باندھ کر کپڑا رکھا جاتا ہے کہ کپڑا کہیں کھسک نہ جائے۔ بہت سے گھروں میں
تو ماہواری کے دنوں میں لڑکی کو باورچی خانے میں کام کرنے نہیں دیا جاتا کہ کیا خبر اس نے پیڈ
ٹھیک کرنے کو ہاتھ لگایا ہو اور ہاتھ دھویا نہ ہو۔ بہت سے گھروں میں ان کپڑوں کو بھی ہاتھ
نہیں لگایا جاتا کہ جو ماہواری کے دنوں میں پہنے ہوں اور ان کو باقاعدہ پاک کیا جاتا ہے۔

ماہواری شروع شروع میں باقاعدہ نہیں ہوتی ہے۔ کبھی ایک دفعہ آکر، پھر سال چھ مہینے
یا تین مہینے نہیں آتی۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ لڑکی گلی میں کھیلتے کھیلتے یا سکول میں دیکھتی ہے کہ اس
کی شلوار خون سے تر بتر ہے۔ دوسری لڑکیاں مذاق اُڑاتی ہیں۔ کچھ لڑکیاں ماہواری کے دنون
میں سکول جانے سے گھبراتی ہیں۔ ویسے بھی سکولوں میں پیڈ رکھنے اور بدلنے کا بھی کوئی معقول انتظا
نہیں ہوتا ہے، جبکہ ایک صحتمند بچی کو دن میں چار یا پانچ مرتبہ پیڈ بدلنا پڑتا ہے اور بدلنا چاہیے۔

لڑکا پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں مردانہ عادات وخواہشات کو محسوس کرتا ہے، جبکہ لڑکی
تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں ہی، ماہواری کے حوالے سے جسمانی بلوغت کے لئے تیار ہوتی ہے۔
اسی لئے ہمارے گھروں میں عموماً ماہواری شروع ہوتے ہی لڑکی کی شادی کردی جاتی تھی۔ لڑکا
اپنے جوان ہونے کی کیفیت کو حیرانی اور خوش کن لذت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے جسم پر رو
ہونے والے بالوں اور منہ پہ داڑھی اور مونچھوں کی علامات کو فخر کے ساتھ دکھاتا اور بتاتا ہے
گویا کہ نسوانیت، شرم اور اپنے آپ کو دست بستہ پیش کرنے کی علامت بن کر اور مردانگی احساس تف
اور اپنے آپ کو سربلند رکھنے کی خواہش کا پرچم بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اگر عورت میں بھی ماہواری
کو احساس فخر کے ساتھ پیش کرنے اور قبول کرنے کا مادہ پیدا کیا جائے اور عورت کو اس ضرور
اخراج کے حوالے سے مادۂ تولید کی موجودگی اور بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے آگاہ کیا جائے
لڑکی میں خود سے نفرت کرنے اور اپنے آپ پر بیچارگی طاری کرنے کا رویہ ختم ہوسکتا ہے۔ بلکہ آج
کے معاشرے میں تو عورت کو اپنے ماہواری کے زمانے کو صلاحیت کے طور پر قبول کرنا چا
ماہواری کے ساتھ ساتھ ذہنی بلوغت شروع ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں معلوم کہ کب اور کہاں تک

مگر یہ حقیقت ہے کہ بہت سی لڑکیاں اپنے ہی ہاتھ کی حرکت سے جنسی اخراج کر کے اپنے عمل اور ردِ عمل کو محسوس کرنا چاہتی ہیں۔ اگر کسی لڑکے اور لڑکی کی جنسی آویزش ہو بھی جائے تو وہ جنسی خواہش کم اور ایک دوسرے کو جاننے اور ایک دوسرے کے بدن کا ردِ عمل اور کشش جاننے کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے جیسے لڑکی جوان ہوتی جاتی ہے۔ اس کی حسیات تیز تر ہوتی جاتی ہیں۔ گھر والوں کا جا و بے جا بوسہ لینا۔ درزی کا اس کا ماپ لیتے ہوئے چھاتیوں اور کولہوں کو ہاتھ لگانا ڈاکٹر کا اس کا دل دیکھتے ہوئے بدن کے مختلف حصوں کو ہاتھ لگانا۔ نائی کا بال کاٹتے ہوئے گردن اور کندھوں کو چھونا۔ یہ سب باتیں، اس میں حسِ جنس بیدار کر سکتی ہیں اور کرتی ہیں۔ مگر وہ بیان نہیں کرتی۔ کئی لڑکیوں کو چھان بورے والے، سبزی بیچنے والے، پردہ کھینچ کر کپڑا دکھانے والے دوکاندار، کبھی پینٹ یا شلوار میں سے اکڑا ہوا عضوِ تناسل دکھا کر لڑکی کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی گھر کے بڑے رشتے دار، لڑکی کو بستر میں اکیلا پا کر۔ پیار کے بہانے اس کے اندر ایسے انگلی گھساتے ہیں کہ لڑکی درد سے تڑپ اٹھتی ہے۔ مگر کچھ کسی کو بتا نہیں سکتی اور اگر بتا بھی دے تو اُسے ہی اَن لبے شرم کا خطاب سننا پڑتا ہے اور یہ فقرہ بھی سننا پڑتا ہے کہ اب کسی کے سامنے بک بک نہ کرنا۔ اس کے علاوہ بازار، بس اور ہجوم میں پاس سے گزرتے لڑکے کا، لڑکی کے پستان دبا کر یا کولہے پر چٹکی کاٹ کر چلے جانا یا پر ہجوم بس میں بالکل ساتھ چمٹ کر کھڑے ہونا حتیٰ کہ لڑکی کو اس کے عضوِ تناسل کا لمس بھی محسوس ہو۔ یہ وہ ساری باتیں ہیں کہ جو اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ مگر نہ وہ ان کا بیان کر سکتی ہے اور نہ اس کی لذت کو پوری طرح محسوس ہی کر سکتی ہے۔ ہر چند اب لڑکیاں خاصی باشعور اور باعلم ہو گئی ہیں۔ مگر ماہرینِ نفسیات کی رائے میں اکثر لڑکیوں کے نزدیک اندامِ نہانی کا مطلب صرف پیشاب کرنے کی جگہ ہے اور کچھ نہیں۔ علاوہ ازیں، مرد میں جنسی جذبات کے ابھار کا اظہار تو عضوِ تناسل کے اکڑنے سے ہو جاتا ہے، مگر عورت میں جنسی خواہش ہو تو اظہار کی کیا صورت اور کیا کیفیت ہو گی۔ اس کا کوئی نہ اندازہ کرتا ہے اور نہ سمجھ سکا ہے۔ مرد کے لئے تو جنسی خواہش کچھ اپنی گرفت

میں لے کر اپنی قوت آزمانے اور اخراج کو تکمیل تک پہنچانے کا رویہ ہے۔ جبکہ لڑکی میں یہ سارا عمل اندر ہی ہوتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے، جنسی خواہش بیدار ہوتی ہے۔ مگر وہ اس کا کچھ علاج نہیں کر سکتی۔ وہ خود کو دوسرے پہ منحصر متصور کرتی ہے۔ اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس کا بدن دوسروں کے لئے ہے اور وہ یوں اپنے متخیلہ کے حوالے سے جنسی آسودگی کیلئے خود کوشی کرتی ہے۔ مرد کے سامنے برہنہ ہونے کے خیال پر ہی اس میں ہیجانی کیفیت بیدار ہو جاتی ہے۔ مگر سب سے خوفناک خیال لڑکی کے سامنے مرد کے عضوِ تناسل کا اس کے اندر داخل ہونے کا ہوتا ہے۔ یہی خوف، رات کو خواب میں ڈاکو لٹیرے کے خیال سے چیخ اٹھنے میں منتقل ہوتا ہے اور کبھی کبھی لڑکی اسی خیال کے باعث، باپ سے بھی متنفر ہوتی ہے۔ تمباکو کی بُو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور وہ عموماً باپ کے غسل خانے سے نکلنے کے بعد غسل خانے میں اسی بُو کے باعث جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ ماہرین نفسیات یہ بھی بتاتے ہیں کہ کئی لڑکیوں کو یہ خواب آتا ہے کہ ان کے ساتھ مرد ان کی بڑی اماؤں کی موجودگی میں مباشرت کر رہے ہیں اور وہ کچھ نہیں کہہ رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ خواہش پوشیدہ ہے کہ مائیں ان کو جنسی آزادی دیں۔

لڑکی بڑی ہونے لگتی ہے تو اس سے ایسی ساری کتابیں چھپائی جاتی ہیں کہ جن کے حوالے سے کسی طرح اُسے جنسی تلذذ کا شائبہ بھی ہو۔ پھر لڑکیاں چھپ کر ایسا مواد حاصل کرتی، پڑھتی اور ایک دوسرے کو لکھتی ہیں۔ ایک لڑکی نے لکھا ہے۔

"میں خود پانچ سال کی تھی اور میرا دوست سات سال کا، ہمیں یہ پتہ تھا کہ لڑکی وہ ہوتی ہے کہ جو ناک یا کان میں کچھ پہنے۔ ایک دفعہ کیا ہوا۔ میرے لڑکے دوست نے کہا مجھے پیشاب آیا ہے۔ میں نے کہا چلو میرے غسل خانے میں کر لو۔ وہاں میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ میرا اور میرے دوست کا بدن تو فرق فرق چیز ہیں۔ اس نے میرا بدن دیکھا۔ ابھی ہم یہ کر ہی رہے تھے کہ میری خالہ آگئی۔ بس اس دن کے بعد ہم دونوں پر نظر رکھی جانے لگی۔"

"نو سال کی عمر میں، میں اپنے دو ساتھی لڑکوں کے ساتھ "شادی شادی" اور "ڈاکٹر ڈاکٹر" کھیل کھیل رہی تھی۔ ان لڑکوں کی عمر بھی آٹھ اور دس سال تھی۔ انہوں نے ڈاکٹری کرتے ہوئے اس کے خاص حصوں کو ہاتھ لگایا۔ پھر ایک دن ان میں سے ایک لڑکے نے اپنے عضوِ تناسل کو میرے اوپر لگاتے ہوئے کہا کہ ان کے والدین نے بھی شادی کے وقت اور بعد میں بھی ایسے ہی کیا تھا۔ مجھے یہ سن کر غصہ آ گیا اور کہا کہ میرے والدین کم از کم اتنی نیچ حرکت نہیں کر سکتے۔ مگر لڑکوں نے کہا کہ سب ماں باپ کرتے ہیں۔ تو لڑکی نے ان کے ساتھ یہ سلسلہ جاری کر لیا آخر کو اس کی خالہ نے پھر دیکھ لیا اور ہمارا ملنا بند ہو گیا۔ مگر ایک بات ہوئی میں نے کسی مرد کو اپنے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ جب بھی اس نے یہ کوشش کی۔ میں یہ کہہ کر الگ ہو گئی کہ شاید کوئی دیکھ رہا ہے یا شاید کوئی آ رہا ہے۔"

ایک دفعہ سکول میں ایک لڑکی نے استاد سے آ کر کہا کہ رات کو پلنگ کے چر چر کرنے کی آواز سے میری آنکھ کھلی، میرا باپ میری ماں پر سوار تھا۔ وہ چیخ دبی تھی اور چند لمحوں کے بعد، باپ نے ڈانٹ کر میری ماں کو کہا، چل جلدی سے غسل خانے جا اور دھو کر آ۔ مجھے اس دن سے باپ بُرا لگنے لگا۔"

مگر وہی لڑکی جب شادی شدہ ہوئی تو اس نے اپنی بہن سے کہا کہ "اس مرد کے سامنے جو تمہارا شوہر ہو، کپڑے اتارنا اور ننگے ہونا، کس قدر اچھا لگتا ہے۔"

معلوم یہ ہوا کہ علم کو جس قدر بھی محدود کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر لڑکی کو اس کے جسم کے قدرتی عوامل، اُبھار اور تبدیلیوں سے نامحسوس اور محسوس واقفیت سے گریزاں نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ اسے سکھایا جائے تو اس میں اپنی ذات کے بارے میں قناعت تفاخر اور احساسِ عزت اور زیادہ ہو گا۔

نوجوان لڑکی

تمام بچپنے کے دوران ڈانٹ ڈپٹ ہر کام اور ہر حرکت سے منع کرنے کی ترغیب جاری رہتی ہے۔ پھر بھی لڑکی خود کو ایک فرد کی صورت میں محسوس کرتی رہتی ہے۔ وہ اپنے گھر، خاندان، دوستوں، کھیل اور سکول کے کام کے دوران خود کو بے معنی متصور بھی کرتی ہے۔ اپنا مستقبل اُسے بس ایک محض خواب کی طرح بھی معلوم ہوتا ہے۔ بلوغت کے ساتھ ہی اس میں مستقبل کے شادیانے، خود بخود بجنے شروع ہو جاتے ہیں۔ نوجوان لڑکا اپنی سمت میں اور نوجوان لڑکی، اپنی سمت میں مستقبل کی طرف سفر شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں لڑکی کی بلوغت ایک مرد کی منتظر نظر آتی ہے۔

نوجوان لڑکا بھی ایک لڑکی کے انتظار میں مستقبل کی سمت سفر شروع کر دیتا ہے مگر لڑکی، اس کی زندگی کے صرف ایک حصے کی وقعت رکھتی ہے۔ وہ اس کی منزل نہیں بنتی ہے۔ مگر لڑکی چاہے آزاد خیال ہو یا رجعت پسند اس کو اپنی معراج ایک جیون ساتھی

کے حصول میں ہی نظر آتی ہے اس کا سبب یہ نہیں کہ والد کے بازوؤں کے بعد ایک باقوت نوجوان کے بازو، اس کو سکون اور اطمینان عطا کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ ابھی تک وسائل کی ساری طنابیں مرد کے ہاتھ میں ہیں اور عورت بچپنے کے انداز میں، اس کی برتری کو اپنی معاشی اور سماجی حفاظت کی خاطر، آسمان پر اُٹھائے رکھتی ہے۔ لڑکی کے والدین، دوست، رشتے دار، اسی سماجی اور معاشی پہلو کے حوالے سے لڑکی کو مستقبل کی جانب گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔

شادی نہ صرف ایک باعزت بلکہ کم خطر اور کم محنت آمیز پیشہ زندگی ہے۔ یہ عورت کو نہ صرف معاشرتی عزت دیتی ہے بلکہ اُسے محبوبہ اور ماں کے پیار کے علاوہ جنسی ضرورت پوری کرنے کا باعزت طریقہ مہیا کرتی ہے۔ شوہر، محافظ کی حیثیت سے بھی، عورت کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ وہ والدین کے گھر کے تحفظ اور نگرانی سے آزاد ہو کر، ذرا بہتر تحفظ اور نگرانی، برنگِ آزادی، یہ لطف حاصل کرتی ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو مرد کے سامنے مکمل طور پر خود حفاظتی اور خود کفالت کے لیے پیش کرتی ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو مرد سے اخلاقی اور مادی طور پر کمتر تسلیم کر کے تعلقات استوار کرتی ہے۔ یہ شعوری کوشش نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ ماضی کی تربیت اور مستقبل کی پیش بندی میں اس کو انہی حوالوں سے تیار کیا جاتا ہے۔

شادی نہ صرف ایک باعزت مستقبل کا راستہ بنتی ہے۔ بلکہ ایک پرانے گھر اور حاکم سے نئے گھر اور نئے حاکم کی غلامی میں خود کو آزاد محسوس کرنے کا ایک راستہ ہے۔ اگر لڑکی خود کو لڑکے سے کمتر قبول کر لیتی ہے تو یوں لڑکے اس سے مسابقت بھی محسوس نہیں کرتے اور یوں خوشی اور مسرت کی کلید لڑکے کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ ویسے بھی بلوغت کے آثار پستان بھاری ہونا، ماہواری کا آنا۔ سر اور کمر کا درد اور اگر ماہواری میں ذرا سی بھی گڑبڑ ہو تو نفسیاتی عوارض۔ یہ سب چیزیں لڑکیوں کو کھیلوں اور ایسے کاموں میں حصہ لینے سے باز رکھتی ہیں۔ جس میں اچھل کود شامل ہو۔ یہیں پہ بین فرق، عورت اور مرد کا شروع ہو جاتا ہے۔ مردانگی

کے بہت سے ودیتوں کی سند، اسی تشدد اور غارت گری کے انداز کو لیا جاتا ہے کہ جہاں مرد بڑکیں مارتے، ایسے ہی کہنیاں مار کر لڑائی مول لیتے، دو چار ڈانگیں چلا لیتے اور غصے میں گندی گندی گالیاں دے لیتے ہیں۔ تقابل میں لڑکی کو ان تمام علامات سے مبرا، بالکل سیدھی سادھی، مرد کے ہر قول اور فعل پر ایمان لانے والی شے سمجھا جاتا ہے۔ وہ خود کسی بات میں پہل کرے یا اپنی انفرادی حیثیت بنائے، اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مجھے ایک لڑکی کا حال معلوم ہے کہ جس کی تربیت بالکل لڑکوں کی طرح ہوئی۔ اس کا بولنا، کپڑے پہننا، ہنسنا بولنا بے جھجک اور مردانہ وار تھا۔ مگر جب ایک دفعہ اس نے لڑکوں کو اپنے بازو اور پٹھے پھلا اکڑا کر دکھاتے اور گالیاں دیتے دیکھا تو اُسے احساس ہوا کہ وہ تو یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔ اس عالم میں واپس پلٹنے کا عمل اسے اور بھی روایتی اور بھی کبیدہ خاطر کر دیتا ہے کہ اُسے اس دلیل کو سمجھتے ہوئے کچھ دقت لگتا ہے کہ چاہے۔ ہیوی ویٹ چیمپئن ہو یا باکسنگ چیمپئن یا سکیٹنگ چیمپئن، سب خصائص اپنے اختلاف کے باوجود اعلیٰ درجے کی یکساں صلاحیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ بہت سے گھروں میں کہ جہاں عورت کی ماہواری، ایک عذاب ہوتی ہے، وہ باورچی خانے میں داخل نہیں ہو سکتی۔ چیزوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ جبکہ دفتروں اور مشقت پر جانے والی عورتوں کے لئے ماہواری تو کیا، بچہ جننا بھی، زندگی کے عام معمولات کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ ایک کوئلہ چننے والی، روڑی کوٹنے والی یا اینٹوں کے بھٹے پہ نوکری کرنے والی خود ہی بچے کو جنم دیتی، آنول صاف کرتی اور پھر بچے کو لپیٹ کر کام کرنے لگ جاتی ہے۔ جبکہ خوشحال گھرانوں میں، لڑکی کا پلنگ سے پیر اتارنا بھی، نسوانی امراض کا سبب سمجھا جاتا ہے۔

گھر میں ماؤں کا رویہ بھی لڑکیوں کے ساتھ سخت گیری کا اور لڑکوں کے ساتھ آزادی کی حوصلہ افزائی کا ہوتا ہے۔ لڑکی کو گھر میں رکھا جانا اور گھر میں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں

مصروف رکھنا، ماں اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اگر لڑکیاں اکٹھی ہو کر باہر نکلیں، پکنک پر یا پھر بازار میں خرید و فروخت کو جائیں تو بھوکی نظریں۔ ان کا تعاقب اس قدر کرتی ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہیں اور کسی قسم کی تفریح یا لطف اندوزی کا خیال ناسور بن جاتا ہے۔
اِسی طرح اچھے گھرانوں اور مہذب لوگوں کی بچیوں میں خود ضبطی، ایک طرح سے عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اِسی لئے وہ یہ سمجھنے پہ مجبور ہوتی ہیں کہ معرکتہ لآرا کام صرف مرد ہی انجام دے سکتے ہیں اور پھر عورت خود کو مرد کے خوابوں کے پیکر میں ڈھالنے کو اپنی معراج سمجھنے لگتی ہے۔ مرد بھی بے باک، ذہین، مہذب، شائستہ اور فکری طور پر پختہ خواتین سے گھبراتے ہیں۔ جیسا کہ ایلیٹ نے کہا تھا کہ بے وقوف خوبصورت لڑکیاں ہی مرد کی ذہنی ہیروئن نکلتی ہیں۔ اُسے تو یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ جہاں کہیں بھی تم نے اپنی ذات کو آگے لانے اور اپنی رائے کو برتر رکھنے کی کوشش کی تو ہمیں تم صنفِ نازک کے دائرے سے باہر ہو جاؤ گی۔ مرد کو جبکہ جوانی کی جانب قدم رکھتے ہوئے، کردار اور رویّے کے اس تضاد کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ذات کا اظہار، رائے زنی اور اپنے ارادے کو تسلیم کرانے میں فوقیت حاصل کرنے ہی کو کہا جاتا ہے۔ لڑکی جیسے جیسے بڑی ہوتی ہے۔ اس کے اندر اس کی ضرورت کا احساس اُجاگر تو کیا جاتا ہے۔ مگر شادی کے بعد اس کی انفرادیت یہی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے فرد اور وجود کو مرد کی ذات کا پرتو سمجھے، اپنی انا کو باطل جانے، جبکہ جوان ہونے کے دوران وہ چھپ کر اپنے پستانوں کی مالش کر کے، ان کی افزائش کی طرف توجہ دیتی ہے اور اپنی مسکراہٹ کی دلفریبی کا خود جائزہ لیتی ہے۔

خود جاذبیت اور جنسیت میں بڑا قریبی رشتہ ہے۔ لڑکی اپنے آپ سے آگاہ ہو کر، اکیلے میں اپنے ننگے سراپا کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھتی ہے۔ کچھ لڑکیاں ایک دوسرے کے پستان مقابلہ کرنے کے لئے دیکھتی ہیں۔ پھر ایک دوسرے کی رازداریاں، اپنی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے، برقرار رکھتی ہیں۔ مگر اس پورے جذباتی دور میں معصومیت زیادہ ہوتی ہے۔

اور لذتیت کم ۔ کچھ لڑکیاں مرد کے نزدیک ہونے میں خوف زیادہ اور لذت کم محسوس کرتے ہوئے ، کئی دفعہ ان مردوں کی جانب ملتفت ہو جاتی ہیں جو یا تو شادی شدہ ہوں یا پھر ان کا عشق اس کی کسی سہیلی یا جاننے والی سے چل رہا ہو ۔ ایسی کئی لڑکیاں ، ساری عمر حسبِ مراد مرد کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں ۔ سبب یہی ہوتا ہے کہ لڑکی کی ایک مقصدی زندگی کے تصور کی بجائے ، ایک ایسی شخصیت بنانے کی جانب توجہ مرکوز کی جاتی ہے کہ جہاں وہ ایک چھپے خزانے کی طرح ہو اور شوہر ایک متلاشی کی طرح اس خزانے کو دریافت کر کے ، اپنے قبضے میں لے لے ۔ پھر وہ مرد کے جذباتی مراحل کی دریافت اور اس کے لبھانے کے نازو انداز کی تربیت کے لئے خود کو وقف کر دیتی ہے ۔ مرد کا گھورنا اُسے بُرا بھی لگتا ہے اور اچھا بھی ، بلوغت کے ساتھ ساتھ اس کو شرمانا اور اپنے آپ پر فخر کرنا بھی آجاتا ہے ۔ وہ اجنبی سے شناسائی کے عالم میں خود کو چھپاتی بھی ہے اور ظاہر بھی کرنا چاہتی ہے ۔ یہی صورتِ حال ' لڑکی کے لئے سب سے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے ، اس کو یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کا اظہارِ شوق ہی اس کی ذات کی نفی کر سکتا ہے ۔ اس مرحلے پہ صرف ایک بوسہ ، محض لمس ، ہاتھ پکڑنا ، اس کو جنسیت کی جانب مائل کر سکتا ہے ، مگر دوسرے ہی لمحے وہ اس خیال اور اس کیفیت پہ خود ہی ہنس بھی پڑتی ہے ۔ وہ بوسہ لینے دیتی ہے ۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ ہونٹوں کو صاف بھی کرتی ہے ۔ وہ مسکراتی اور محبت سے جواب دیتی ہے ، مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ایک لمحے میں درشتی اور سخت غیر محبانہ انداز میں گفتگو شروع کر دیتی ہے ۔ یہ ساری کیفیات کہ جن کو نیمے دروں اور نیمے بروں کا نام دیا جا سکتا ہے ۔ نیم وحشیانہ اور نیم عقلی کی ان کیفیات پر مبنی ہوتی ہیں کہ جن سے ایک لڑکی گزر رہی ہوتی ہے ۔ وہ اپنے مستقبل کو قابو میں کرنا چاہتی ہے ۔ مگر اپنا دامن ماضی سے چھڑا نہیں سکتی ہے ۔ ہر خوف کے پیچھے ایک خواہش اور بغاوت کے پیچھے اس کا خوف کارفرما ہوتا ہے ۔ بالغ لڑکیاں جب ایک دوسرے کو جنسی تعارف کے قصے سناتی ہیں تو کبھی کھل کھلا کر ہنستی ہیں تو کبھی ایک

دوسرے کو دیکھ کر یا مردوں کو گزرتا دیکھ کر ہنستی اور ایک دوسرے کو ویسے ہی بغل گیری کے انداز میں پکڑتی ہیں۔ لڑکی کا بغاوت کا انداز بھی خود اذیتی پر مبنی ہوتا ہے۔ خود سوزی خودکشی، اپنے آپ پر تیزاب پھینک لینا۔ یہ ساری علامات اپنی ذات کے اظہار کی کوششیں ہی تو ہیں۔ کبھی کبھی یہ انداز شوخی کا رنگ لئے ہوتا ہے۔ گمنام خط، ٹیلیفون، دوسروں کو ڈرانا، توہماتی قصّے سنانا۔ لڑکیوں میں بغاوت کے اظہار ہی کے طریقے ہیں، جہاں یہ سب ممکن نہ ہو، وہاں گلی یا سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اپنی ذات کے اظہار کے لئے کبھی کھڑکی سے بہت نیچے جھانکنا آواز لگانا کھڑکی میں کھڑے ہو کر بال بنانا' سنگھار کرنا، یہ سب اظہارِ ذات کے محدود رویّے ہیں کہ ان میں خوف اور توقعات دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ سولہ سال کی لڑکی کو جنس کی خواہش بھی ہوتی ہے اور ماہواری کا دورانیہ بھی باقاعدگی اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ اب آنکھوں میں حیرت کی کیفیت اور انتظار کا عالم زیادہ ہوتا ہے۔ اب جسم کی صباحت کی مسحوریت زیادہ اور حقیقت کو تسلیم کرنے کا عمل کم مرد بھی اسی عالمِ جذب و کیف کو پسند کرتے ہیں۔ بلکہ جو لڑکی اس قسم کے نخرے نہیں کرتی۔ وہ ان کے لئے عجائبِ روزگار شخصیت بنتی ہے۔ وہ مرد کی مطیع بنتی ہے کہ مرد کی خواہش حکمرانی اس کی خواہاں ہوتی ہے اور عورت یہ ساری چاہت اور اطاعت کے ڈھونگ رچانے کی بچپن سے باقاعدہ تربیت بھی لیتی ہے کہ اس کا اپنے جسم و جذبات، سب کچھ چھپانے کا عمل، گویا دوھری اخلاقیات کا عمل ہوتا ہے۔ صرف افسوسناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ جب لڑکی مسحوریت اور دوسروں کو ملتفت کرنے کے عمل سے گزر رہی ہوتی ہے۔ تو اس وقت اس کی اپنی شخصیت کی نفی اور مرد کی شخصیت کی پرورش اس قیمت پر بھی ہو رہی ہوتی ہے۔ اُمید اور خواہش کے آسرے پر زندگی گزارنے والی، دنیا کو کس قدر توت دے سکتی ہے۔ اس کا آپ خود اندازہ کر لیں۔

مگر کچھ لڑکیوں میں اس تضاد کے باعث، کمال صلابت کردار آجاتی ہے۔ وہ

اپنے باغی خیالات کو زمانے کی روایت سے زیادہ اہمیت دیتی ہے مگر اُسے تبادلۂ خیالات کے لئے کوئی ایسا ہم عصر یا دوست نہیں ملتا کہ جس کا نقطۂ نظر بھی اس جیسا ہو۔ کچھ لڑکیاں شاعری پڑھنی شروع کر دیتی ہیں۔ ان سے کم عقل اور کم ذہین فلمی گانوں کو اپنے خیالات کا آئینہ سمجھ کر سنتی ہیں۔ اس میں خود اپنے جذبات کے اظہار کی نہ قوت ہوتی ہے نہ نمو کچھ لڑکیاں باغبانی کچن گارڈن اور جانور پالنے کی جانب اپنے اظہار کی قوت کا رُخ موڑ دیتی ہیں اور کچھ خدا سے لو لگا لیتی ہیں اور کچھ عورتیں ساری عمر بچپنے کے رویے اختیار کئے رکھتی ہیں۔ لڑکیاں بالغ ہوتے ہی، ماں کے مشفقانہ رویے کو بھی تکلیف دہ اور نگرانی کو اذیت سمجھتی ہیں۔ جو لڑکیاں شادی سے پہلے کام کرتی ہیں وہ خود کو بطور لڑکی نہیں بطور فرد کے محسوس کروانا چاہتی ہیں۔

نوجوان لڑکی کا کردار اور رویہ، اس کا ماحول بناتے ہیں۔ آج کی دنیا میں جبکہ لڑکی اپنا مستقبل خود بنا رہی ہے۔ کہیں وہ کھیلوں میں، کہیں ادب، کہیں سیاست اور سماجیات اور کہیں پیشہ ور شعبوں میں مہارت حاصل کر کے مرد کے حصار اور مجازیت کی سجدہ گیری سے آزاد ہو رہی ہے۔ مگر اب اُسے اپنے جتنا بالغ، آزادی پسند اور مساوات کا خواہاں، مرد نہیں ملتا۔ جبکہ خاندان والے بھی اس کے ان رویوں کو صحت مند نظروں سے نہیں دیکھتے اور جب عورت اپنی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور مرد کے لئے اپنی زندگی اور اپنے دل میں جگہ بناتی ہے۔ وہ گھر اور دفتر، دونوں شعبوں کو اپنی زندگی کا محور و مرکز بنا کر، اپنے معمولات مرتب کرتی ہے۔ مگر پھر ہر طرف سے ہاہاکار کہ یہ کس طرح ممکن ہے، گھر اور دفتر دونوں کس طرح چلیں گے۔ آخر کو آپ سنتے ہیں کہ ڈاکٹر، گلوکار، انجینئر، مصور، رقاصہ گویا ہر فنکارہ، فن تیاگ کر، گھر کی طرف پوری توجہ دینے لگی ہے۔ جب تک معاشی مساوات عملی شکل اختیار نہیں کرے گی۔ اسی قسم کی صورتِ حال بار بار پیدا ہوتی رہے گی۔

عورت ۔ زمانۂ جوانی میں

عورت کی جنسی خواہش بھی مرد کی طرح بچپن ہی میں بیدار ہو جاتی ہے ۔ ذائقہ اور لمس کے ساتھ ساتھ بدن کے اعضا بھی جنسی حسیت کو جلا بخشتے ہیں ۔ بہت سے ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ لڑکی کے پہلے جنسی رویّے سے اس کی ساری زندگی کا رویہ طے پاتا ہے ۔

ایک مرد کے لئے ، بچپن سے جوانی تک ، جنسی تعارف کا عمل لڑکی کے مقابلے میں ذرا زیادہ واضح اور غیر پیچیدہ ہوتا ہے ۔ مرد جنسی عمل کے لئے ، اپنی آزادی برقرار رکھتے ہوئے ، افتخار اور تناؤ کے ساتھ لڑکی کی جانب بڑھتا ہے ۔ لمس ، جذب ، چومنا ، پیار کرنا ' یہ ساری کیفیتیں لذت کو دوچند کرنے میں ممد قوتوں کے طور پر آشکار ہوتی ہیں ۔ اس کا اخراج اور بڑھتے ہوئے تموج سے آزادی ، اس کے لئے اعتماد و اطمینان کی نوید بے شک نہ ہو ، مگر اس کے اپنے آپ سے آگاہ ہونے کی نشانی تو بنتی ہے ۔

عورت کے سلسلے میں عمل اور ردِّ عمل بالکل متضاد ہوتا ہے ۔ عورت جنسیت محسوس کرتی ہے ۔ مگر جب تک اندامِ نہانی ، مرد کے عضوِ تناسل سے متصل نہ ہو ۔ اس وقت تک

کیفیت بھرپور نہیں ہوتی ہے۔ ویسے بھی مرد کے لہجے میں عورت کی نسائیت لوٹنا، اس کی دوشیزگی کو ختم کرنے کا سنہری تمغہ حاصل کرنے اور اس کی جنسیت کو پہلی بار آشکار کرنے کا سرخاب کا پر لگانے کا رویّہ، مرد کا رویّہ بنتا ہے۔

ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات نے اس کی تصدیق کی ہے کہ بچپن میں ہی بہت سی بچیوں کو اندامِ نہانی پر ہاتھ رکھنے سے بھی جنسی لذت محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ بہت سی ادھیڑ عمر کی عورتیں تو اپنے ہاتھ سے رگڑ کر وقتی طور پر جنسی گھٹن سے آزادی حاصل کر لیتی ہیں۔ ہمارے ہاں عمومی جنسی عمل، مرد کے عمل پر منحصر محسوس کیا جاتا اور دکھایا جاتا ہے۔ جو چاہے مرد کرے، جیسے چاہے وہ عورت کے بدن کو چھوئے، نہ چاہے تو یہ بھی نہ کرے، صرف اپنی لذّت کے حصول کے لئے دخول کے عمل کو ہی کافی جانے اور پھر یہ جادہ جا ـــــ وہ عورت کو جتنی بار چاہے، جیسے چاہے جنسی عمل کے لئے استعمال کر سکتا ہے، ہاں خود اس کا ذاتی جنسی عمل اس کے اکڑاؤ اور کیفیتِ جنس میں مضمر ہوتا ہے۔ بہت سے مرد نہ جنسیت سے پہلے یہ معلوم کرنے کے متمنی ہوتے ہیں اور نہ جنسیت کے بعد کہ عورت بھی اس لذّت و عمل سے گزری ہے کہ نہیں۔ لذت کے بغیر بھی، حمل ٹھہر جانا اسی لئے ممکن ہے کہ مادہ تولید عورت کے بیضہ تولید سے وصال پاکر حمل کا محرک ہوتا ہے۔

ہماری تہذیب میں، عورت کی عصمت ہوتی ہے اور مرد کی جنسی آزادی۔ عورت کی جنسیت صرف شادی اور اس مرد سے منسوب کہ جس سے اس کی شادی ہو۔ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک جنسیت کے قانونی عمل کے جواب میں عورت کو جہیز، منہ دکھائی اور پھر ماہانہ گزارہ الاؤنس بھی ملتا ہے۔ اس رشتے میں کوئی برابری اور باہمی عزت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شادی اور طوائفیت، دونوں طریقوں سے پتہ چلتا ہے کہ عورت خود کو ایک مرد کے حوالے کرتی ہے۔ جس کے جواب میں طوائف کو یکمشت شبینہ اور بیوی کو ماہانہ گزارہ الاؤنس اور گھر کی نقاب ملتی ہے۔ جو لڑکے نوکرانیوں کی عصمت لوٹ لیتے ہیں،

وہاں بے چاری نوکرانیوں کو ہی بدچلن کہا جاتا ہے۔ مگر جہاں لڑکی کسی ڈرائیور یا مالی کے ساتھ رشتہ قائم کرلیتی ہے۔ اسے فوراً گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ لڑکے کیلئے عشق کا مطلب؛ فتح مندی ہے۔

ایک مرد۔ عورت رکھنے کے احساس تفاخر کو مخصوص رویوں یعنی "وہ میری ہے یا "میری منگ ہے" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ مرد کا احساس تسخیر اور تفاخر کچھ عسکری نوعیت کی علامات سے اخذ شدہ ہے کہ جیسے مملکت فتح کرتے ہیں۔ عورت حاصل کرنا بھی اسی درجے کی تسخیر سمجھی جاتی ہے۔ برصغیر میں شادی کا پورا عمل، گھوڑے پر چڑھ کر جانا ڈھول بجا کر اور دھمال ڈال کر واپس آنا۔ یہ سب باتیں، تسخیر مملکت کی طرح عورت تسخیر کرنے کی باتیں ہیں۔ جسمانی ساخت اور معاشرتی عوامل بھی مرد کو ہیرو بنانے میں مددگار کردار ادا کرتی ہیں۔ غصہ اور حاکمیت اس کی معراج قرار پاتی ہے اور عورت کا کام حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہوتا ہے اور بس رہے خدا کا نام۔

جن معاشرتی اور سماجی عوامل میں مرد کی جنسی زندگی پرورش پاتی ہے، عورت ان سے بالکل مختلف عوامل میں سانس لے رہی ہوتی ہے۔ جب وہ مرد سے پہلے بہل ملتی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ جنسی جذبات سے بے بہرہ ہوتی ہے یا اس میں جنسی خواہش نام کو نہیں ہوتی۔ اکثر لوگوں کو تو صرف ہاتھ ملا کر ہی جنسی خواہش محسوس ہونے لگتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عورت کو اپنی جنسی خواہش اور ضرورت کا، باقاعدہ عمل سے پہلے معقول اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ جن جسمانی اعضا کے بارے میں ادب اور مذہب میں تذکرہ ملتا ہے۔ وہ ان سے واقفیت اور اُن سے حظ اُٹھانے کی تربیت کو اوّلیت دیتی ہے۔ کیونکہ جنسی خواہش میں خواب، توقع، ارمان اور آسودگی کا کوئی نہ کوئی تصور یقیناً پنہاں ہوتا ہے۔ لڑکی نوجوانی میں پسندیدگی کے معاملات میں بھی ملائمت اور نزاکت کو اوّلیت دیتی ہے۔ بچے اکثر اپنی ماں کے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر "نرم جلد" کی لذت اور لمس کو محسوس کرتے

ہیں۔ جبکہ ایک مضبوط توانا اور کبھی کبھی کھردرے جسم کے جوان آدمی کے بازوؤں میں، عورت ایک قیدی، ایک قابو میں کئے جانے والے جسم کی حیثیت سے منتقل ہو جاتی ہے۔
اسی طرح بہت سی عورتیں، تیرہ چودہ سال کی عمر کے لڑکوں کے ساتھ جنسی زندگی مقابلتاً ایک جوان اور توانا مرد کے پسند کرتی ہیں۔ مگر عورتوں کی اکثریت میں، صرف مرد کی رضا کے سامنے سر جھکانا ہی فلسفۂ زلیست قرار پاتا ہے۔ عورت کی رضامندی اور جنس کیلئے تیاری صرف کپڑے اُتار دینے اور مرد کی تیاری کے سامنے بلا چون و چرا حاضر ہونے میں نہیں بلکہ سانس نبض، جلد کی گرماہٹ، اندام نہانی کی رطوبت اور وا ہونے کے انداز میں منعکس ہوتا ہے۔ یعنی مرد کی طرح عورت میں ایک زبردست جنسی خواہش کی بیداری ہی صحیح جنسی عمل کی تکمیل کر سکتی ہے۔ ویسے جنسی طور پر بیدار خواتین کی جبلت، عادت اور خوش طبعی اور جنسی طور پر یخ خواتین کی خاموش طبعی ویسے ہی طبیعتوں کے فرق کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ یہاں کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں کہ یخ طبع خواتین میں یخ بستگی کسی نفسیاتی وجہ سے ہوتی ہے۔ یا معاشرتی جبر کے باعث۔ ویسے تو جنسی تربیت کھیل کی تربیت کے دوران بھی ہو جاتی ہے۔ کھیل کا شوق، جنس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سکنڈے نیویا کی عورتیں صحت مند اور چاق و چوبند ہوتی ہیں، اٹلی اور سپین کی عورتیں بہت سلیقے اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ جنسی زندگی کو پسند کرتی ہیں۔ جو عورت عشق کی لذت میں سرشار ہوتی ہے، وہ نہ تو مردہ ہوتی ہے اور نہ خود فراموش۔ اس کے اندر خواہشوں کا مدوجزر، اس کو زندہ اور خوش و خرم رکھتا ہے کچھ عورتیں کاٹتی ہیں۔ نوچتی ہیں اور اپنی جنسی خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح کچھ مرد کاٹتے، عورت کو ایک طرح سے بھنبھوڑتے اور اس کے جسم پر نیل ڈالنے ہی کو اپنی جنسی تسکین کا طریقہ سمجھتے ہیں۔ بہر صورت، جسمانی اور ذہنی ہم آہنگی ہی دونوں افراد کو صحیح لذت فراہم کر سکتی ہے۔

ان باتوں کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ لڑکی اگر بچپن میں خوف یا کسی قسم کی جنسی

نفرت میں گرفتار ہو جائے تو اس کے لئے ان تعصبات پر حاوی آنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سخت گیر تربیت، جنس کے نام پر احساس گناہ اور جرم اس حد تک ہولناک متصور ہوتے ہیں کہ اگر اس کا زیاں ہو جائے تو قانونی اور باقاعدہ شادی ناممکنات معلوم ہوتی ہے۔ شادی کی رات، اس شخص کے ساتھ گزارنی کہ جس کے ساتھ نہ پہلے تعارف ہو اور نہ پہلے اس کی شکل دیکھی ہو۔ اس کے ساتھ نوجوانی اور دوشیزگی کی منزل سے بغیر حیل وحجت گزرنا۔ گویا خوابوں کی دنیا میں خارزار زندگی میں لہولہان ہونے کے مترادف ہوتا ہے۔ اگر منگنی، نکاح یا پھر صرف کورٹ شپ چل رہی ہو۔ تب بھی لڑکی صرف ظاہری محبتوں یعنی شادیوں، پارٹیوں اور پکنکوں میں اکٹھے ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتی ہے۔

جنس میں پہل اور اوّلیت مرد کی ہی میراث سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہ معلوم بھی ہو کہ اس دوشیزگی کو عورت کا درجہ دینے کا حق بھی اُسے ہی حاصل ہو رہا ہے تو اور بھی سرخوشی کا عالم ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایک نوجوان لڑکی کو اپنے بدن کی بازیافت و دریافت میں ایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرد کا عمومی طور پر یہ پہلا تجربہ نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ لڑکی کیلئے عموماً یہ پہلی منزل ہوتی ہے۔ شوہر یا محبوب کو تو بس لئے بستر تک لیجا کر لٹانا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی عورت کا اختیار ختم اور مرد کا کل اختیار حاوی۔ کچھ مرد ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جب تک پوری ایریکشن نہ ہو، وہ عورت کے سامنے تمام کپڑے اُتارنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ عورتیں ننگی ہو کر پیچھے سے بھی مرد کو اپنا آپ دکھانا پسند نہیں کرتی ہیں کہ پستان اور کولھے ہی اُنہیں چھپانے کی چیز معلوم ہوتی ہیں۔ کچھ لڑکیاں کپڑے اُتار کر بڑے ناز اور افتخار سے اپنے بدن کو مرد کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ متضاد اس کے کچھ لڑکیاں صرف لائٹ بند کر کے ہی کپڑے اُتارنا اور کپڑے اُتار کر چادر میں چھپنا ہی پسند کرتی ہیں۔

یہاں مرد کو پدرانہ اور مشفقانہ انداز اختیار کرتے ہوئے عورت کو اپنا آپ سمجھوانا اور پسند کروانا پڑتا ہے۔ کئی لڑکیوں کو اپنے چھوٹے پستانوں کو عیب سمجھنے کا خوف ہوتا تو دوسری کئی لڑکیوں

کو بڑے پستانوں سے خوف آتا ہے۔ اسی طرح اندامِ نہانی کے بارے میں بہت عجیب و غریب مفروضوں پر اپنا دماغ صرف کرتی رہتی ہیں۔

جو لڑکیاں ان خدشات میں مبتلا نہیں ہوتیں۔ وہ کئی اور مفروضے قائم کئے رہتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جنسی اختلاط کے بعد، ان کی کوئی پوشیدہ چیز باہر آجائے گی۔ یہی حال پہلی شب کے معاملات کا بھی ہوتا ہے۔ مرد سے خوف، اتصال سے پیدا ہونے والی وحشت یہ ساری باتیں عجیب مخمصے پیدا کر دیتی ہیں۔ کئی عورتیں یہی اندرونی خوف ظاہر نہ کرنے کے باعث "یخ زدگی" کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایک عورت کی کمر میں ہمیشہ کے لئے درد ٹھہر گیا اور وہ بالکل یخ ہو گئی کہ شادی کی رات اس کے شوہر نے اُسے طعنے دیئے تھے کہ وہ دوشیزہ نہیں تھی۔ ایک اور عورت کا احوال یہ ہے کہ شادی کی رات اس کے میاں نے اس کی موٹی اور بھدی ٹانگوں کے بارے میں بہت مکروہ ریمارکس دیئے تھے۔ ایک اور عورت کی یخ بستگی کی داستان کا پس منظر یہ ہے کہ اس کے نازک بدن ہونے کا اس کے میاں نے مذاق اُڑایا تھا۔ عورت کو گھورنا یا اس کو بے ہودگی سے برتنا۔ دونوں عوامل بُرے اور ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ عورت، بچپن میں مرد کی طرح مار کٹائی۔ دھونسے لگانے اور مکے مارنے کے عمل سے بھی نہیں گزرتی۔ اس لئے باہوں میں جکڑ کر وحشیانہ انداز کا پیار، اُسے خوفزدہ بھی کرتا ہے اور گھبرا بھی دیتا ہے اور دخول کا عمل، مرد کیلئے فتح کا اعلان، مگر عورت کے لئے، اذیت، کسی چیز کے پھٹ جانے کے خوف کا عمل ہوتا ہے۔ جسمانی اعضا میں، مرد کا عضوِ تناسل ظاہر میں ایک انگلی کی طرح کھڑا نظر تو آتا ہے۔ جبکہ عورت کا اندامِ نہانی تو خود عورت کے لئے ایک عجوبہ اور سربستہ راز عضو ہوتا ہے۔ عورت کا ہر ماہ حیض کا آنا، پھر مرد کا ضرورتِ جنس کے لئے اکڑ جانا اور عورت کا بھیگ جانا، یہ متضاد عوامل بھی، تناؤ پیدا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے حمل ٹھہر جانے کا خوف عورت کو مرد کے ساتھ کھل کر جنسی عمل سے مانع رکھتا ہے۔

اگر عورت مرد پر اعتماد نہیں رکھتی تو جنسی فعل کے دوران اتصال کی کیفیت میں سرشاری کے لمحے کم اور احتیاط کے لمحے زیادہ ہوں گے کہ وہ حمل ٹھہرنے کی ہر کیفیت سے گریز چاہے گی۔ جن لڑکیوں کو احتیاطی تدابیر آتی ہیں۔ وہ تو شادی سے پہلے بھی گولیاں کھانے سے لے کر اندام نہانی کو محفوظ رکھنے کے طریقے بصد احتیاط کر لیتی ہیں۔ لیکن جو ان امور سے ناواقف ہوں۔ وہ تو پریشانی اور گھبراہٹ میں لطف تو کیا لے سکیں۔ وہ تو ہذیان میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف مرد حضرات، اپنے طور کسی قسم کی حفاظتی تدبیر اختیار کرنے کو لذت میں کمی کے مترادف سمجھتے ہیں اور ایف ایل کے علاوہ آپریشن کے عمل کو بھی اپنی جنسی زندگی کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہوئے بیک وقت عورت کو انہی احتیاطی تدابیر پہ اکسانے کا کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ جن جگہوں اور مقامات پر تعلیم نے لڑکیوں میں اپنی جنس سے آگاہی کر دی ہے۔ وہ ایسے خدشات جسم میں تبدیلیوں اور ہر قسم کے استحصال سے نبرد آزما ہو سکتی ہیں۔ مگر پھر بھی معاشرتی پابندیوں کے باعث علم اور عمل کا فرق بہر حال موجود رہتا ہے۔ کچھ لڑکیاں اس تعلیم کا غلط مطلب یہ نکالتی ہیں کہ وہ جنسی تجربے کرنے کو عملی تربیت اور تعلیم سمجھتی ہیں اور ایک کے بعد دوسرے مرد کے ساتھ جنسی تجربے کو اپنی حیرت اور پریشانی کا حل سمجھتی ہیں۔ اس قسم کی لڑکیاں جب کسی تجربے کار مرد کے ہتھے چڑھتی ہیں تو بالکل ایک نئی نویلی لڑکی کی طرح مدافعانہ عمل کرنے اور خود کو ناواقف ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بچپن کے تجربے کے باعث، وہ ساری عمر ذہنی طور پہ بچگانہ ردِ عمل کی اسیر رہتی ہیں۔ پیار کرنے پہ وہ ہنستی ہیں اور جسمانی اتصال انہیں بچگانہ کھیل معلوم ہوتا ہے اور اگر وہ کسی وقت اس موڈ میں نہ ہوں تو محبوب کی خواہش انہیں احمقانہ معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کا اعلان بھی کر دیتی ہیں۔ اس طرح ذہنی طور پر یہ خواتین نیم یخ قرار دی جاتی ہیں۔

عورت کی جنس کی خواہش، مرد کی خواہشات اور طریق کار کے زیر اثر نہیں ہوتی ہے۔ وہ خود اپنی جنسی طلب میں مرد کو تیار کرتی۔ ساری شہوتوں کا مرکز بن کر، جنسی لذت کو معراج پہ پہنچا

کر، فارغ ہو کر، خود ہی اس عمل کا سنگین ترین مذاق بھی بنا سکتی ہے۔ جس میں وہ مرد کو کمزور ظاہر اور ثابت کرنے کے کئی طریقے آزما سکتی ہے۔ اس لئے جنس کے مسئلے پر مرد کا رویہ اور طریق کار بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اگر اس کا رویہ عورت کی جانب صرف بہیمانہ لذت حاصل کرنے اور عورت کو روئی کی طرح دُھنکنے کا ہے۔ تو پھر عورت میں "شریک" ہونے کا جذبہ مفقود ہو جائے گا۔ بہت سے مرد، صرف اپنے اخراج کو اہمیت دیتے ہیں اور عورت میں حس جنس تک سے بھی آگاہ نہیں ہوتے ہیں۔ جنس میں برتری نہیں چلتی ہے۔ بلکہ برابری اور مساوات، جذباتی ہم آہنگی اور جذباتی عزت بنیادی جنسی لذت کا تلازمہ بنتے ہیں۔

بہت سے مرد سارا دن عورت کو ذلیل کر کے رات کو شلوار کھول دینے کی درخواست کو اس کی عزت افزائی سمجھتے ہیں۔ جبکہ عورت اِسے بھی اُسی تذلیل کے رویّے کا شاخسانہ سمجھتی ہے کہ جو انہوں نے دن بھر روا رکھا ہوتا ہے۔ اگر عورت، اپنی دلی نفرت اور برافروختگی کو ظاہر نہ کرے اور جنسی عمل کو خود پر طاری کر کے، شریکِ کار ہونے کی کوشش کرے یا ظاہر کرے، تب بھی جنسی بُعد، اگر مرد ذہین ہے تو اس پر واضح ہو جائے گا۔

برصغیر میں مرد جنسی اختلاط کے دوران یا پڑھتے ہیں یا سگریٹ پیتے ہیں کہ جنسی اختلاط کو طویل بنانے اور عورت کو مائل کرنے کے لئے ایسے طریقوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مغرب اور مشرق میں یہ بھی عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ مرد جنسی اختلاط کو دھرا کر یا لمبا کر کے اتنا طول دیتے ہیں کہ عورت یا تو چیخ پڑتی ہے یا پھر گڑگڑا کر ان سے معافی مانگتی ہے کہ اب تو میری جان بخشی کرو۔ مرد اکثر دفعہ سمجھتا ہے کہ جنسی بہیمانہ رویہ، عورت پہ مرد کا رعب ڈالتا ہے۔ جبکہ عورت میں جنس کا لطف اُٹھانے کا سحر بیدار کرنا عجیب و غریب فضا قائم کرنے پر منحصر ہوتا ہے۔ یہی فضا کی مسحوریت ہے کہ پُرسکون جنسی اختلاط میں آنکھیں بند کرنے کا عمل بھی نظر آتا ہے کہ وہ ساری فضا کو اس لمحے میں مرکوز کر دینا چاہتی ہے۔ ایک دوسرے میں تحلیل ہو جانے کی خواہش میں وہ موضوع رہنا پسند کرتی ہے،

جبکہ اس کا وجود اور اس کی ساخت معروض کے نقطۂ نظر سے ہے۔ اگر اس لمحے
عورت کو یہ خیال ہو یا یہ احساس ہو جائے کہ انفصال اور تحلیل ہونے کی خواہش باہمی
نہیں بلکہ صرف عورت کی جانب سے ہے اور اُسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مثلاً مرکزی
عمل جنس کے فوراً بعد، مرد کا رویہ کیا ہوتا ہے۔ کیا وہ قطعی عورت سے غافل اور لاتعلق
ہو کر سگریٹ پینا، کافی پینا، پانی پینا، یا باہر کھلی ہوا میں گھومنا چاہتا ہے، جبکہ عورت
انہی نزاکتوں کو برقرار رکھتے ہوئے، ساتھ لیٹے، بلکہ اُوپر ہی لیٹے رہنے کی خواہش رکھتی
ہے۔ تو پھر یہ تضاد، عورت کو دھچکے کے ساتھ بیزار اور برافروختہ کر دیتا ہے۔ پھر مرد
کی جانب سے بے ساختہ ایسے سوال "کیا تمہیں مزا آیا؟" "کیا یہ کافی تھا؟" "کیا تم اور چاہتی
ہو؟" ایسے بے ہودہ اور غیر جذباتی لگتے ہیں کہ عورت بھنا کر رہ جاتی ہے۔ ان سوالوں
میں بھی حاکمیت کا لہجہ حاوی ہوتا ہے۔ یعنی میں اور کچھ بھی دے سکتا تھا۔ یا تمہارے
ساتھ اس سے بھی زیادہ سخت جسمانی تحرک کے ساتھ جنسی عمل کر سکتا تھا۔ مگر تمہارے جسم کی
ناتوانی کو ملحوظ رکھ کر میں نے نرمی برتی ہے۔ یوں عورت کے تصور میں بستر، ایک اکھاڑے
کی زیادہ حیثیت رکھتا ہے اور انصال رُوح کی کم،

ایک اور اندازِ فکر بھی ہے کہ کچھ مرد، عورت میں دخول کو اپنی ذات کی تکمیل اور بدن
کا حصہ سمجھتے ہیں اسی طرح کچھ عورتیں اسی طرح مرد کے دخول کو اپنی ذات اور اپنے بدن کی
ضرورت اور حصہ سمجھتی ہیں۔ اس قسم کے خیالات، جنسی عمل کو جذباتی کیفیات کے باعث
مزید دلچسپ اور دیرپا بناتے ہیں۔ مرد کا اظہارِ مردانگی اور عورت کا مسکرانا، ایک دوسرے
کے وجود کو تسلیم کرنے کے مترادف بن کر، جنسی عمل کو دیرپا بناتے ہیں۔ گویا دونوں جسموں
اور رُوحوں کی فیاضی، ایک مکمل رشتے کی بنیاد بنتے ہیں، اس دیرپا رشتے میں اندرونی لہر
کے دو رخ ہوتے ہیں، ایک یہ کہ عورت بزدلی کا اظہار کرے اور مرد انتہائی جرأت مندی
کا، یہیں یہ عقدہ کھلتا ہے کہ عورت میں جنسی سخاوت اور پائندگی کے در عمر کی تیسویں منزل

کے بعد جا کر عام طور پر کیوں کھلتے ہیں۔ اگر اس عمر تک وہ شادی شدہ زندگی گزار رہی ہوتی ہے، تو مرد یہ باور کرتا ہے کہ عورت تو یخ بستگی کی ماری ہوئی ہے۔ وہ عورت کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر کہیں عورت، خواہش کا برملا اظہار کرتی ہے، تو مرد اُسے فحش اور نا روا قرار دیتا ہے۔

عورت کی جنسی معراج کے بہت سے عوامل میں اس کی مالی اور تہذیبی مرکباتی صورت بھی بہت اہم اثرات چھوڑتی ہے۔ اسی لئے عورتوں کی جنسی زندگی میں بھی مرد کی طرح کئی ایسے عوامل نظر آتے ہیں کہ جہاں عورتیں، عورتوں کے ساتھ جنسیت کی لذت میں زیادہ مسحوریت اور آسائش محسوس کرتی ہیں۔ یہ موضوع ایک علیحدہ باب کا متقاضی ہے۔

لزبین

ہمارا عمومی خیال یہ ہے کہ لزبین عورت وہ ہوگی کہ جو لمبی چوڑی، پینٹ، ہیٹ اور ٹائی پہنے، مردانگی کا برملا اظہار کرتی دکھائی دے گی۔ حالانکہ حرم میں موجود عورتیں بھی لزبین ہوتی ہیں اور طوائفوں میں بھی یہ قسم عام طور پر پائی جاتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ لزبین عورتیں، جسم اور ظاہری ساخت میں، دیگر عورتوں سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ عورت مرد کے باہمی ربط میں بھی ہوتا ہے کہ کئی مرد، نسوانی طرز کے رویے جنس میں اپنا کر، پہل کرنے، جذباتی انگیخت اور دیگر عوامل عورت پر چھوڑ کر، خود کو عورت پرست اور عورت کی رہنمائی میں پروان چڑھنے دینے ہی میں لطف لیتے ہیں۔ اسی طرح کئی مرد، جن کی جنسی قوت میں فروغ، جسم اور عمر کے لحاظ سے نہیں بلکہ کمتر ہوتا ہے، ان کو نسوانی کہا جانے لگتا ہے۔ لزبین اندازِ عمل میں ایسے عوامل کارفرما ہونے کی اوّلیت لازمی اور ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک عورت کہ جس میں مردانہ اور زنانہ، دونوں اصناف کا ہنرِ جنس ہو، وہ نسوانی جنسیت کا

ہی صرف مظاہرہ کرے۔ جب عورت میں مردانہ ہارمونز بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی علامات واضح ہوتی ہیں۔ یعنی اُن کے چہرے پر داڑھی والی جگہ پر بال نکل آتے ہیں۔ بال ان عورتوں کے چہروں پر بھی نکل آتے ہیں کہ جن کے اندر نسوانی ہارمونز کم ہوتے ہیں۔ ایک عورت کہ جس کے ساتھ جنسی جبر یا زیادتی کی گئی ہو، وہ اپنی اس نفسیاتی خامی کو دور کرنے کے لئے ممکن ہے، عورت ہی کے ساتھ جنسیت کر کے اپنی ذات کی تشفی کرنی چاہتی ہو۔ ایک عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں اس نے بطور سپاہی فوج میں شمولیت کی اور بارڈر پر بھیج دی گئی۔ اس دوران اس کی سپاہی کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ مگر اُس نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ عورت ہے۔ دونوں میں جنسی تعلقات قائم ہوئے اور پھر بھی یہ چھپا رہا کہ وہ عورت تھی اور کامریڈ اُسے ہوموسیکسوئل سمجھتا رہا۔ بچپن میں لڑکی اور لڑکے کا ماسٹربیشن کا عمل بھی شروع شروع میں یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ یہ بڑے ہو کر لزبین اور ہومو ہونے میں مدد دیتا ہے۔ مگر اس بات کو کلیتے کے طور پر مانا نہیں جا سکتا ہے کہ ماہرینِ نفسیات کی نظر میں جنسیت کا یہ فعل، کسی جسمانی قوت کی کمی یا زیادتی کے باعث نہیں۔ فرائڈ کے نقطہ نظر سے ماں باپ کو جنسی فعل میں مصروف دیکھنے سے باپ بن کر جنس کرنے کی خواہش لزبین انداز کو فروغ دے سکتی ہے۔ آڈلر کے خیال میں یہ کسی قسم کی معکوسیت نہیں بلکہ مرد کی حاوی آنے کی قدرت کو یکسر نہ مانتے ہوئے خود ہی اس طریقے پر برتاؤ کرنا کہ اس میں سب مردانہ خصائص بدرجۂ اتم ظاہر ہوں۔ مگر ان ہر دو مفروضوں سے ماورا، لزبین عورت نہ تو "نا عورت" ہوتی ہے اور نہ "نامرد" عورت، مرد کے باہمی تعلقات میں عورت کو زیردست کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے اور زبردست کا کردار مرد، خود اپنے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ جو عورت اس کلیۂ جنس سے اختلاف کرتی ہے۔ اس کے بہت سے اعمال میں سے ایک عمل "لزبین" ہونے کا بھی ہو سکتا ہے اور اگر فطرت کی بات کی جائے تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تمام عورتیں "لزبین" ہوتی ہیں۔ ہر نوجوان لڑکی، مرد کے دخول اور اس کے حاوی آنے سے خوفزدہ ہوتی ہے۔ جبکہ

عورت کا بدن اس کی ہی طرح کے عجائبات کا مرقّع ہوتے ہوئے بھی بہرحال خوفزدہ کرنے والی چیز نہیں ہوتی ہے۔

"لزبین" میں بھی دو اقسام ہوتی ہیں۔ایک وہ جو مرد کے وجود سے خوفزدہ ہوکر ایک دوسرے میں مدغم ہونا پسند کرتی ہیں اور دوسرے وہ کہ جو مرد کی نقل کرنا، پسند کرتی ہیں۔ویسے تو ہمارے سارے معاشروں میں اگر عورت اپنی انفرادیت کو عمومی رویوں سے ہٹ کر برتتی ہے اور ذرا تھوڑا سا بھی مختلف کردار ظاہر کرتی ہے۔ تو فوراً اُسے مردانہ وار رہنے کا شرف دے دیا جاتا ہے۔ لڑکیاں ایک دوسرے کو سمجھنے اور بدن میں تبدیلیوں کو محسوس کرنے کے لئے ایک دوسرے کی چھاتیاں پکڑتی، رانوں پر ہاتھ پھیر کر لمس کی لذت حاصل کرتی اور پھر اسی عمل کے دوران اگر جنسیت کی خواہش بیدار ہو جائے تو آپس میں ایک دوسرے کو رگڑ رگڑا کر اظہار کی راہ پانے کی کوشش کرتی ہیں اور پھر یہ اُن کا آپس کا راز بن جاتا ہے۔ جب شادی ہوتی ہے تو وہ شوہر کے ساتھ جنسیت سے خوفزدہ کم اور لذت زیادہ محسوس کرتی ہیں۔

ان سے الگ، دو اور طرح کی عورتیں "لزبین" کہلاتی ہیں۔ ایک تو مردانہ انداز کی خواتین کہ جو ہو بہو مرد کی نقالی کرتی ہیں اور ایک وہ جو مرد سے خوفزدہ ہوتی ہیں، کچھ عورتیں حاوی آنے کا شوق رکھتی ہیں اور کچھ صرف خود کو منکسر المزاجی سے پیش کرنے میں ہی لذت محسوس کرتی ہیں۔ ایک نفسیاتی سروے میں بے شمار عورتوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اُن کے عورت ہونے کو جس تحقیر کے ساتھ بلایا جاتا ہے، وہ حقارت اُن کی زندگی میں زہر بن کر سرایت کر جاتی ہے اور بہت سی ایسی ہی عورتیں، ہم جنسیت کا شکار ہو جاتی ہیں بہت سی نیم بالغ لڑکیاں، عورت نہ ہونے کے احساسِ کمتری کا بے سبب شکار ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بدصورت عورتیں بھی اسی احساسِ کمتری میں ہم جنسیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ہمارے معاشروں میں لڑکے اور لڑکیوں میں کپڑے پہننے کا فرق بھی، لڑکی میں لڑکے پہ

رشک کرنے اور آزادئ لباس رکھنے کی خواہش کو جنم دیتا ہے۔

ویسے قبول صورت اور متناسب جسم کی لڑکی بھی کہ جو آزادئ رائے اور اظہار کی خواہشمند ہو، وہ مرد کے حیوانیاتی اظہار کو اپنی آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر، ہم جنسیت پر مائل ہو جاتی ہے اور وہ مسکین عورت کے ساتھ ہم جنسیت کے علاوہ بھی سارے رویوں میں مردانہ طرزِ عمل اختیار کرتی ہے۔ بہت سی کھلاڑی لڑکیاں بھی ہم جنسیت کا شکار ہوتی ہیں۔ ان تمام تجزیوں میں ایک بنیادی کلیہ نکلتا ہے اور وہ ہے کہ جسم اپنے واسطے "اور جسم دوسروں کے واسطے" کا بنیادی فرق ویسے تو دانشور اور ذہین خواتین بھی مرد کے سامنے صرف اپنے آپ کو ڈال دینے سے گریز کرتی ہیں۔

اگر دونوں جنسوں میں برابری اور مساوات کو عمل میں لانے کی کوشش کی بھی جائے تو بھی مرد اپنی برتری کے حصار سے آزاد نہیں ہوتا اور ایک ذہین عورت ایسے رویے کو تضحیک کے مترادف سمجھتی ہے۔ وہ فرد کے طور پر اپنی آزادی کی قربانی دینا نہیں چاہتی بلکہ جنسی جذب حاصل کرنے میں وہ بطور فرد شریک ہوتی اور اُسے اپنا بطورِ فرد عمل شمار بھی کرتی ہے۔ ویسے بہت سی دانشور اور لکھنے والی خواتین بھی ہم جنسیت کا شکار پائی گئی ہیں۔ ہر چند ہم جنسیت تسکین اور کل لذتی کا بدل کسی طرح بھی نہیں ہے۔ ایک سولہ سالہ لڑکی نے کہ جو ابتدا میں "لزبین" تھی۔ اپنے آپ کو عورت ہی کا جنسی شکار پاکر، فرار کی یہ راہ اختیار کی کہ لڑکیوں سے نفرت، پڑھنے میں خود کو زیادہ مصروف اور شراب نوشی بعد ازاں اس نے شادی کر لی۔ مگر اُس شادی کو اس نے "مرد کا وحشیانہ جنسی رویہ" قرار دیا۔ مرد کو چھوڑ کر۔ پھر عورتوں کے ساتھ روابط کی جانب پلٹ آئی اور اب اس کا انداز قطعی مردانہ، عورتوں کے ساتھ تھا اور مردوں ساتھ، عورتوں کی طرز کا اور یوں وہ دونوں اصناف کے ساتھ غیر مطمئن رہی

لزبین عورت، اپنے عورت پن کے نقصان کا ازالہ، اپنے افعال سے کر لیتی ہے۔

مگر پھر بھی ایک عورت کی حیثیت سے وہ ناکامیاب ہوتی ہے۔ نہ مرد کی طرح سے۔ اور یہی کیفیت اس کو نفسیاتی عوارض کا شکار بنا سکتی ہے۔ ایسے ہی نفسیاتی عوارض میں مبتلا ایک خاتون نے کہا تھا۔ کاش میں کچھ ایسے اعضاء رکھتی کہ جن کے ذریعہ دخول ممکن ہوتا۔ "لزبین"

اپنی نفسیاتی خامی کو بظاہر بڑے وکھ رکھاؤ اور خود کو بڑی جنسی شے بنا کر پیش کر کے ظاہر ہونا چاہتی ہے۔ یہ مرحلہ ان لڑکیوں پہ بھی آتا ہے کہ جن کی پرداخت، لڑکوں کی طرح ہوتی ہے۔ ایک لڑکی کہ جس کی پرورش لڑکوں کی طرح ہوئی۔ جسے گھڑ سواری سے لے کر نیزہ بازی، تیرنا اور چلنا مردوں کی طرح سکھایا گیا، وہ تیرہ سال کی عمر میں ایک لڑکی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو کر بھاگ گئی۔ گھر پر وہ لڑکوں کے کپڑے ہی پہنا کرتی اور اپنے سے بڑی عمر کی عورتوں کے لئے جنسی کشش بھی محسوس کرتی۔ اس کے کتنی ہی عورتوں کے ساتھ معاشقے بھی رہے۔ وہ اپنے سے دس سال بڑی خاتون کے ساتھ شادی کر کے بھی تین سال تک اکٹھی رہی اور بعد میں اس سے قطع تعلق بڑی مشکل سے کر پائی۔ بعد میں اس کی شادی، ایک نوجوان استانی سے ہوئی۔ لڑکے کے والدین کو یہی علم تھا کہ وہ مرد ہے اور شادی تمام روایات و لوازمات کے ساتھ ہوئی۔

وہ ظاہر کرنے کو شیو بھی کرتی تھی۔ مگر ہوٹل کے نوکروں نے اپنے قیافوں اور اندازوں سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ وہ مرد نہیں۔ خاتون ہے۔ بعد میں اسی خاتون کو دھوکہ دہی کے الزام میں سزا بھی ہوئی تھی۔

اس مثال سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ لڑکی کو مردوں میں بھی لڑکوں کی طرح لایا اور لے جایا جانا غلط عمل ہے۔ دوسرے اس قدر مردانگی سکھانے کے باوجود، وہ خاتون اپنے سے بڑی عمر کی خواتین سے روابط کو بہتر خیال کرتی تھی، یہ منطقی نتیجہ اس امر کا بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہ لڑکی باپ کی نگرانی اور بے پناہ شفقت میں پلی تھی مگر پھر بھی اس کے لاشعور میں ماں کی چاہت اور ماں سے تعلق سراب کی طرح گردش کرتا رہا، اور یہی تلاش اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے قربت کی خواہش کو ابھارتی رہی۔

جو لڑکیاں ماؤں کی لاڈلی ہوں۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر سوئیں حتیٰ کہ ایک دوسرے کی چھاتیاں بھی چومیں، بدن کی لذت محسوس کریں۔ وہ بعد میں بھی انہی

خواص کو پسند کرتی ہیں۔ اُن کے متضاد رویّے بھی ایسے ہی خصائص کو جنم دے سکتے ہیں۔ مثلاً بُری اور سخت ماں کے رویّے سے دل برداشتہ ہو کر، لڑکی بہتر اور شفیق ماں کی خواہش میں اپنے سے بڑی عورت کے قرب کی خواہاں ہو سکتی ہے۔ اگر بڑی عمر کی عورت بھی دلچسپی کا اظہار کرے۔ تو چھوٹی عمر کی خاتون منفعل رویّہ اختیار کرنا اور بڑی عمر کی عورت مستعد رویّہ ہی پسند کرے گی۔ اب یہ رشتہ صرف افلاطونی محبت پہ اختتام پذیر ہوتا ہے کہ اس کا جسمانی قرب پہ انجام ہوتا ہے۔ بہرحال یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ ہم جنسیت کا بنیادی سبب کیا تھا کہ یہی چند لڑکیاں، لڑکی کے اثر سے نکل کر جب مرد کی باہنوں میں پہنچتی ہیں تو زیادہ تحفظ و آرام محسوس کرتی ہیں۔ یہ لڑکیاں باقاعدہ ہم جنسیت نہیں کر سکتیں، ہم جنسیت صرف وہ کر سکتی ہیں کہ جو مرد کے مقابلے میں باہمی نسوانی تعلق زیادہ مستحکم اور خود کو جسمانی طور پر زیادہ قریب محسوس کریں۔

عورتوں کے باہمی اور عورت اور مرد کے مابین تعلقات کی بنیاد بالکل مختلف ہوتی ہے۔ عورتیں ایک دوسرے کے بدن کو چھو کر جسم میں موجود ہیجانی کیفیات کو باہمی اختلاط کے ذریعہ نکال دیتی ہیں یا اُن سے نجات حاصل کرتی ہیں۔ جبکہ عورت اور مرد کے مابین تعلقات میں عورت اپنے بدن کی نرمی، لذت اور اعصابیت کو نچوڑ کر مرد کے اتصال کے پاتال میں اُتار دیتی ہے۔

شیشے میں خود اپنا بدن دیکھتے رہنے کی نرگسیت، کسی اور کو یوں اپنا بدن دکھانے کی نفسیات میں بدل کر ہم جنسیت کا روپ لے سکتی ہے۔ بچے کو کمر پر چڑھا کر جھولا جھلانا، نفسیاتی طور پر، جنسی لذت حاصل کرنے کا طریقہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ہر قسم کے جذبۂ محبت میں دو متضاد قوتیں بیک وقت کام کر رہی ہوتی ہیں۔ ایک کا قابو پانے کا شوق اور دوسرے کا باہنوں میں کھنچے چلے آنے کا جنون، اسی لئے کچھ عورتیں کہ جو اپنی زندگی کا مقصود کچھ بلندیاں حاصل کرنا یا زندگی میں نام پیدا کرنا بنا لیتی ہیں۔ وہ بھی مرد کے تعلق کے مقابلے میں عورت کے ساتھ روابط کو اپنے اس نصب العین کی راہ کی رکاوٹ نہیں سمجھتی ہیں۔

مختصر یہ کہ کوئی ایک سبب یا وجہ لزبین ہونے کی نہیں۔ بلکہ کئی ایک وجوہات حادثات اور واقعات مل کر طرزِ عمل کی بنیاد ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ہم دیکھتے کہ ہوسٹلوں میں ہم جنسیت بہت عام ہے۔ اسی طرح جن اداروں میں صرف عورتیں کام کرتی ہیں اور وہاں مرد کا گزر اور داخلہ بہت کم ہے۔ ان اداروں میں بھی ہم جنسیت نظر آتی ہے۔ اس کا سبب ہر چند یہ ہو سکتا ہے کہ عورت، عورت کی جانب اسی لئے ملتفت ہوئی ہو کہ مرد نے اسے مایوس کیا ہو۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ عورت، مرد میں بھی ایک اور عورت کی متلاشی ہو اور اسی تلاشِ لاحصول نے اُسے مرد سے کنارہ کش اور عورت سے ہم جنسیت پہ آمادہ کیا ہو۔

ایک اور کلیت کہ جو عورتوں کی ہم جنسیت میں واضح ہوتی ہے وہ مرد اور عورت کے مابین پُرتکلف قسم کے ماحول کے برعکس قطعی طور پر واضح اور بے تکلف اور پُرخلوص ماحول کی موجودگی' اس ہم جنسیت میں جنونیت کم اور طمانیت اور سکون زیادہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مرد کو عورت کا بدن' لوتھڑا' اور عورت کو مرد کا بدن اذیت کا استعارہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک خاتون سارا پونسوبنی کا قصہ مشہور ہی ہے کہ اس کا دوسری عورت سے تعلق، کوئی پچاس برس تک بغیر کسی حجاب دخلل کے جاری رہا۔

عورت اور مرد کے مابین رشتوں میں، دو خصوصیات ہوتی ہیں' ایک تو یہ کہ عورت' مرد کے لئے خاص قسم کی محبت، توجہ اور خلوص قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ جبکہ مرد ، عورت کے حسن کی تعریف سے لے کر اس کے جذبات کے احترام کے لئے اپنی عادات واطوار کو حتی الامکان تبدیل کرتا ہے، مگر عورتیں ایک دوسرے کے لئے سخت بے رحم ہوتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے حسد کرنے یعنی کسی اور عورت یا مرد سے ملنے کے بارے میں بھی انتہائی جذباتی رویہ رکھتی ہیں۔

ایک اور خاصیت جو لزبین عورت میں بدرجہ اتم پائی جانے لگتی ہے۔ وہ ہے۔ تمام تر موجود عوامل پر قابو پانے کی عادت۔ وہ مرد کے بغیر مردانہ حرکات کرتی ہیں۔ وہ

ایک دوسرے کی عزت، اپنی اپنی عورتوں کے حوالے سے کرتی ہیں۔ ویسے یہ ضروری نہیں کہ لزبین مستعد عورت، مردانہ کپڑے ہی پہنے، مگر گاڑی چلانے سے۔ لے کر پستول پاس رکھنے تک کے عوامل، سب اس پر حاوی رہتے ہیں۔ وہ شراب پینے، سگریٹ نوشی، گالی گلوچ سے لبریز جا و بے جا تحاشہ زبان کے استعمال اور ایسے ماحول میں رہنے کہ جس کو خواتین اپنے لئے خوفناک سمجھیں۔ بڑا لذت آور، خیال کرتی ہے۔ مگر یہ عورت، مردوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو تو بجا مگر ایسی عورتوں سے ملاقات کو نامعقول قرار دیتی ہیں کہ جو کسی فن میں مشاق اور خود آگاہ نہ ہوں۔ عمومی طور پر لزبین خواتین، مردوں کی صحبت اور ہم جنسی کو نامعقولیت پر محمول سمجھتی ہیں۔ اس میں ایک خوف کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ مرد کا ظالمانہ انداز، لڑائی مار کٹائی کا طریقہ اور عورت کو کمتر سمجھنے کا احساس، ان خواتین کو باہمی دوستی اور میل جول کو مستحکم کرنے پہ آمادہ کرتا ہے۔ پہلے پہل تو مرد کے خلاف مردانہ طرزِ عمل، خود عورت کا اختیار کرنا، ردِ عمل کے طور پر ہوتا ہے۔ بعدازاں یہی ردِ عمل، عادت بنتا جاتا ہے۔ گویا مرد سے آزاد ہونے کا سلسلہ مرد سے خائف ہونے پر محمول ہو کر، ایک اور گرفتاری اور سلسلۂ قید کا شاخسانہ بنتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جنسیت، ایک غیر قدرتی رویہ ہے، جو کہ تاریخی، سماجی، تہذیبی معاشی اور جسمانی رویوں کے حوالے سے، وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مگر انجام اس کا خود فریبی، کبھی خود اذیتی اور کبھی خود اسیری کی شکل میں نظر آتا ہے۔

حصّہ دوم

شادی شدہ عورت

شادی کی شکل میں معاشرہ، عورت کو منتہائے مقصود عطا کرتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ زیادہ تر عورتیں شادی شدہ ہیں یا خواہشمند ہیں یا پھر آزردہ کہ ان کی شادی نہ ہو سکی۔ مجرد عورت کی تشریح بھی، شادی کے حوالے سے ہوتی ہے کہ آیا عورت باغی ہے۔ بیزار ہے یا اس ادارے سے خود کو غیر متعلق ظاہر کرتی ہے۔

عورت کے کردار کو معاشی نقطۂ نظر سے متعین ہوتے دیکھ کر بھی شادی کے ادارے کی فعالیت کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اب شادی کو دو آزاد افراد کے درمیان ذاتی رضامندی کے بعد، معاہدے کی شکل دی جا رہی ہے اور یہ معاہدہ بالکل ذاتی اور بالکل افہام و تفہیم کا رشتہ ہے۔ کسی اور سے جنسی رشتہ، دونوں افراد کے لئے، معاہدے کو منسوخ کرنے کی نشانی ہوتی ہے۔ عورت کا کام محض بچے پیدا کرنا نہیں رہا، بلکہ یہ عمل بھی کہ زچگی کے اخراجات، بہر حال حکومت کارکن عورت اور کارکن شوہر کی بیوی کے، ہر دو طرح ادا کرتی ہے۔ سوویٹ روس میں ایک عرصے تک شادی، دو آزاد افراد کے درمیان ایک معاہدہ سمجھا جاتا رہا۔ مگر اب لگتا یہ ہے کہ جیسے حکومت

کی عائد کردہ ذمہ داری کو دونوں افراد نبھاتے ہیں۔ اب اِن تمام مروجہ طریقوں میں سے کونسا طریقہ جاودانی حاصل کرے گا۔ اس کا انحصار تو مستقبل کے معاشرے پہ ہوگا۔ بہرحال مرد کی حاکمیت کا سحر ٹوٹ رہا ہے بہرحال آج کا دور، عورت کے نقطہ نظر سے، درمیان کا زمانہ ہے کہ عورتوں کی بہت ہی قلیل تعداد کام میں مصروف ہے۔ جدید شادی کا تصور، ماضی کے تسلسلِ معاشرت کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

شادی، عورت اور مرد، دونوں کے لئے مختلف چیز رہی ہے۔ ہر چند دونوں جنسیں ایک دوسرے کے لئے ہیں۔ مگر یہ ضرورت اور لازمیت، آپس کی رواداری کی آئینہ دار کم ہوتی ہے عورت نے مساوات کی بنیاد پر مرد کے ساتھ مقابلہ کرنے یا کھڑا ہونے کی بھی کوشش نہیں کی ہے۔ مرد ایک آزاد اور بااختیار فرد ہوتا ہے کہ جو پیداواری قوت کا منبع بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اسی لئے عورت کا کام کہ جو بذاتِ خود، مکمل پیداواری قوت کا نوایاں ہوتا ہے، مگر بے قیمت قرار دیئے جانے کے باعث، مساوی قرار نہیں پاتا ہے۔ ہر چند مرد کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرانے طرز کے رویوں میں تو اگر مرد خود کو سنبھال نہیں سکتا ہے۔ تو یہ بھی عیب گردانا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے زرعی شعبے میں مرد، عورت کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ بے شمار مردوں کے لئے یہ ایک آسان اور منظم طریقہ خاندان بڑھانے اور کام کرنے کا رہتا ہے۔ عورت، باپوں، بھائیوں اور شوہروں کے اسی معاشرے میں سب کچھ کرنے کے باوجود، ثانوی حیثیت میں رہتی ہے اور شادی کے وقت ایک مرد، دوسرے مرد کے ساتھ اس کی زندگی کے مستقبل کو بغیر عورت کے مشورے کے طے کرتا ہے بات تب بھی بہتر نہیں ہوتی ہے۔ جبکہ ارتقائی شکل کے باوجود، عورت شادی کو ایک معاہدے کی شکل میں دیکھتی ہے کہ اب جہیز اور وراثت، اس کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھتی ہیں۔ بہت عرصے تک، داماد اور سُسر کے درمیان، بجائے میاں بیوی کے معاہدے ہوتے رہے ہے۔ کچھ معاشروں میں بیوہ کو آزادی حاصل تھی نوجوان لڑکی کی آزادی کی خواہش تو پروان ہی نہیں چڑھ سکتی تھی۔ شادی ہی اس کی پرورش اور اس کی زندگی کو بامقصد ثابت کرنے کا راستہ تھی۔ اس کے بھی

چاہتی ہے تو وہ شادی کرے، آج کی فرانسیسی بہت سی مڈل کلاس عورتیں، آزادی حاصل کرنے کو شادی کر لیتی ہیں۔ بہت سی امریکی لڑکیوں نے بھی جنسی آزادی حاصل کر لی ہے، مگر وہ تجربات سے گزر کر شادی کسی خاص وقت پر کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ امریکہ اور فرانس میں ایک اہم بات یہ متصور کی جاتی ہے کہ اگر عورت محض کماتی ہے تو پھر وہ ایک نامکمل فرد ہے، اگر اُسے باعزت فرد کا مقام حاصل کرنا ہے تو پھر وہ منگنی شادی کی انگوٹھی ضرور پہنے۔ اسی طرح زچگی بھی شادی شدہ عورت کے لئے لائقِ احترام ہے۔ غیر شادی شدہ عورت کی زچگی لائقِ تکذیب اور معاشرے کیلئے قابلِ نفریں بات ہے۔

اسی لئے آج کے معاشرے میں، ترقی یافتہ یا پسماندہ کسی گھرانے کی بھی لڑکی سے مستقبل کا احوال پوچھو تو وہ یہی کہتی نظر آتی ہے "میں شادی کرنا چاہتی ہوں"۔ جبکہ کوئی نوجوان آدمی، شادی کو اپنی زندگی کا مقصود نہیں سمجھتا ہے۔ اس کے لئے معاشی فتح مندی، شعور بخشتی ہے۔ اسی بہانے شادی بھی ہو سکتی ہے کہ جدید معاشرے میں شادی نوجوان فرد کے لئے بہت سی ذمہ داریاں ساتھ لاتی ہے۔ ہر چند شادی، جنسی اور معاشرتی آسودگی کو آسان بنا دیتی ہے کہ وہ انسان کو تنہائی کے آسیب سے رہا کرا کے، اپنے وجود کی تکمیل کا احساس، بیوی اور بچوں کی شکل میں دلاتی ہے۔

فرانس میں بھی، خاندان کی رضامندی سے شادی، ایک عام بات ہے کہ سب رؤسا اسی رسم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ زیادہ امیر طبقے میں لڑکیوں کو اپنی ماؤں کی نگرانی میں لڑکوں سے ملنے کی اجازت ہے۔ ترقی یافتہ لڑکیاں البتہ باہر نکلنی، کام کرتی اور مرد سے مقابلتاً آسانی سے مل سکتی ہیں۔ میڈم کلیر لیپلا نے ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان، متوسط طبقے میں شادی کے اعداد و شمار جمع کئے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان سے رضامندی کی شادی تقریباً نابود ہو چکی ہے، چند شادیاں، پادریوں یا رشتہ کرانے والوں کے ذریعہ ہوتی تھیں، سماجی تعلق ۴۸ فیصد شادی کا سبب تھا، ۲۲ فیصد میں تعلیمی یا پیشہ ورانہ ہمواریت، شادی کا سبب بنی، ۲۰ فیصد ذاتی میل ملاقات کی بنا پر، بچپن کی دوستیوں کی بنا پر، شاذونادر، ہاں ۳۰ سے ۷۰ فیصد شادیاں

میں بیسیرا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ۴۸ فیصد والدین لڑکی کی شادی کے لئے فکر مند پائے گئے۔ ۱۷ فیصد لڑکیاں، گھر رکھنی چاہتے تھے۔ ۳۶ فیصد لڑکیاں شادی کے لئے بے چین تھیں، ۲۸ فیصد، شادی کی خواہشمند تھیں۔ ۲۶ فیصد یہ کہتی تھیں کہ بُری شادی سے شادی نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ایک مسلمہ بات تھی کہ لڑکیاں سمجھتی تھیں کہ شادی سے ان کی آزادی بڑھ جاتی ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے یہ کہا کہ لڑکوں سے زیادہ مستعد اور فعال کردار لڑکیاں ادا کرتی ہیں کہ شادی کے معاملے میں پہل وہ کرتی ہیں۔ مگر اسی پہل میں بھی خوف کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ چونکہ شادی، عورت کے لئے بہتر منفعت کا راستہ کھولتی ہے۔ اس لئے مرد کے مقابلے میں عورت اس کی زیادہ خواہاں ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ، عورت سے زیادہ قربانی کی توقع بھی شادی کا ادارہ ہی کرتا ہے۔ جیسے جیسے شادی کا زمانہ نزدیک آتا ہے۔ لڑکی ماں باپ کا گھر چھوڑنے کے خیال سے پریشان بھی ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح نوجوان مرد بھی ذمہ داریوں کو بے پناہ محسوس کریں تو پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خوف کا ایک سبب شادی سے پہلے عشقیہ تجربات کا بھید کھلنے کا خدشہ بھی ہوتا ہے کہ یوں باعصمت نہ ہونا، مرد پہ پہلی رات ظاہر ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ مزید یہ خیال بھی خوف زدہ کرتا ہے کہ ایک غیر مرد کے ہاتھ میں کل اپنا آپ ایک ہی رات میں سونپ دینا، کتنا عجیب اور کتنا ناقابل یقین ہے زیادہ تر لڑکیاں ان تمام خدشات اور حوالوں کے باوجود شادی کرنے پہ رضا مند اس لئے ہوتی ہیں کہ وہ بیوی اور ماں کے درجات بہرحال حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

شادی عام طور پر عشق کا نتیجہ نہیں ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرائڈ نے کہا ہے کہ شوہر، عاشق کے متبادل کی حیثیت سے ہوتا ہے کہ عورت اسی تصور کو بہت سمجھتی ہے۔ یہ تصور، شادی کے ادارے کا اثبات بھی کرتا ہے کہ معاشی اور جنسی ارتباط کی بہترین شکل بہرحال شادی ہی ہے کہ یہ معاشرے اور فرد، دونوں کا مفاد اور امن سلامت رکھتی ہے۔ مسلمانوں میں تو عام طور پر لڑکا، لڑکی۔ شادی کی پہلی رات ہی ایک دوسرے کو دیکھتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ مرد۔ شادی کو نسل بڑھانے

کا وسیلہ ہی سمجھتے ہیں۔ یہاں ایک اور مفروضہ واضح ہوتا ہے کہ مرد، عورت کو تسخیر کرتا اور اگر موقع ملے تو منتخب کرتا ہے۔ شادی، مرد کی آزادی کو سلب کرتی ہے۔ مگر آزادی کے بغیر نہ محبت ہوتی ہے۔ نہ انفرادیت۔ اسی لئے زندگی بھر کے تحفظ کی خاطر، اُسے کسی خاص فرد کے عشق سے اجتناب کر کے، شوہرانہ خصائص کے مرد کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بہت ہی پاکباز ماں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ محبت تو مرد کے لئے ہوتی ہے اور عورت کے لئے تو یہ شجرِ ممنوعہ ہوتی ہے۔ یہاں ہیگل کا یہ نقطۂ نظر استدلال حاصل کرتا ہے کہ عورت کے بطور ماں یا بیوی، رشتے یا تعلقات انفرادی نہیں بلکہ عمومی ہوتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ عورت کیلئے کوئی خاص شوہر نہیں بلکہ کوئی شوہر مسئلہ ہوتا ہے اس کے رشتے اس کے انفرادی جذبوں پہ نہیں بلکہ عمومی جذبوں پہ انحصار کرتے ہیں۔ اس کے لئے تو فرد کی خواہش غیر اخلاقی امر ہوتی ہے اور نسوانی فرائض ادا کرتی رہتی ہے۔ جہاں تک عشقیہ جذبات کا تعلق ہے تو عورت کو جنسی تعلق صرف اس مرد سے رکھنا ہوتا ہے کہ جو اس کا شوہر ہو، مقصود یہ کہ جب جنسی عمل، ادارے کے ماتحت ہو تو وہاں عورت جنسی عمل، لذت یا خوشی کے لئے کم اور پیداواری قوت بڑھانے کے لئے زیادہ کرتی ہے، مونٹین کے نقطۂ نظر سے شادی ایک پاک اقدام ہے اور اس کی کوئی بھی لذت، مستحکم، سنجیدہ اور ایک دوسرے پہ اختیار کی سند لئے ہوئے ہونی چاہیے۔

"یہ بھی درست ہے کہ اگر مرد، عورت میں جنسی لذت کو اُبھارتا ہے۔ تو وہ بھی اپنی لذت کو دوچند کرنے کے لئے۔ بقول مونٹین ہم عورت کو نازک، چکنی، پاکباز، گویا جو بھی چاہتے ہیں۔ وہ غرض اپنی ہی خواہش کی آسودگی کے لئے ہوتی ہے۔ پراؤ دھون کے مطابق شادی تو محبت کے جذبے کو مفقود کر دیتی ہے۔"

البتہ اُنیسویں صدی میں، متوسط طبقے کے خیالات بہتر ہو گئے تھے کہ کوشش یہ تھی کہ شادی کے ادارے کو بہر طور بچا لیا جائے۔ مگر دوسری طرف، انفرادیت کی ہوا، عورت کے اختیار حاصل کرنے کی کوشش کو مزید دبا نہیں سکی۔ سینٹ سیمون، فاریئر، جارج سینڈ اور دیگر رومانی

پرستوں نے محبت کا بہت علم بلند کیا ہے۔ یہ مسئلہ شادی اور ذاتی جذبات کے آمیزے کے تصور کو مستحکم کرنے کی کوشش ہے۔ بلزاک نے رجعت پسند درمیانے طبقے کو خارج از منطق گردہ قرار دیا ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ محبت اور شادی میں کوئی قدرِ مشترک نہیں ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ متبادل اور اسی طرح باعزت طریقِ زندگی کہ جس میں عورت کو شے سے زیادہ اہمیت دی جائے، بنانے سے قاصر ہے۔ تبھی وہ کہتا ہے کہ شادی کا ایسا معاشرتی معاہدہ ہے کہ جس میں بچے پیدا کرنا قانون ہو جاتا ہے اور جس میں محبت بکواس ہوتی ہے۔ پھر وہ شادی کے فلسفے پہ بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ شوہر کا اصل مسئلہ پیار حاصل کرنا نہیں بلکہ دھوکے سے محفوظ رہنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو پھوہڑ، بدتمیز اور کمزور رکھنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا کہ یوں اُسے اپنی عزت محفوظ معلوم ہوتی ہے۔ کیا بلزاک کو یہ اندازہ تھا کہ محبت کی بجائے نفرت اور گھبراہٹ ایسے رویوں سے پیدا ہوتی ہے کہ اگر محبت نہیں ہے تو پھر درمیانہ راستہ اور کوئی نہیں

شادی اور محبت میں رابطے کا پل، قدرت ہی بنا سکتی ہے۔ کیرک گارڈ کے بقول، محبت بے ارادی اور شادی با ارادی ہوتی ہے۔ ہاں شادی کرنے یا شادی کے فیصلے سے، محبت کا احساس ہونا، ناقابلِ یقین بات نہیں ہے۔ یعنی مذہب پہ ایمان رکھتے ہوئے ایک شخص محبت کو شادی کی رسم کا پابند کرنا چاہتا ہے کہ جس کے ذریعہ جذبات اور ذمہ داری کا امتزاج پیدا ہوتا ہے۔ ہاں یہ جذبہ ساری عمر رہتا ہے، یہ بات معجزانہ ہوتی ہے۔ امریکہ میں بھی، انفرادیت پسند بھی شادی اور جنسی ضرورت کو لائقِ عمل تصور قرار دیتی ہیں۔ یہ بات بھی تسلیم کی جاتی ہے کہ عورت کو بھی جنسی لذت کی ضرورت ہوتی ہے اور مرد کو ایسے تکنیکی رویے آنے چاہئیں۔ اگر کسی مرد کو کتابوں کے ذریعے، بیس طرح کے جنسی ردِ عمل کے زاویے آتے ہوں، تب بھی یہ ضروری اور لازمی نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو جذباتی طور پر شیشے میں اُتار سکے گا۔ روایتی شادی میں تو یہ تصور ناممکن کی حد تک ہے۔

پرانے زمانوں کے مادرانہ تشخص کے دور میں، عورت کا باہمت ہونا، لازمہ نہیں تھا۔

بلکہ رسوم و رواج کے مطابق، شادی سے پہلے، اس کا عصمت کھو دینا، خرابی قرار پاتی تھی۔ فرانس کے کچھ علاقوں میں اب بھی یہی رواج ہے۔ بلکہ بے عصمت خاتون کو شوہر، جلدی مل جاتا ہے۔ آزادی پسند حلقوں میں، لڑکی کو بھی لڑکے کی طرح کی آزادی دی جاتی ہے۔ مگر اخلاقیات کا تقاضہ وہاں بھی یہی ہے کہ لڑکی کی شادی باعصمت ہونے پہ ہی کی جائے۔ فرانس کے کچھ علاقوں میں یہ رسم بھی ہے کہ دولہا برات کی رات جب تک باہر نکل کر خون آلود رومال نہیں دکھاتا، اس کے دوست باہر بیٹھے ڈھول بجاتے اور گاتے رہتے ہیں۔ پھر والدین یہی رومال اگلے دن دوستوں اور رشتہ داروں کو دکھاتے ہیں۔ اس سے ذرا کم برُے طریقوں میں سہی۔ مگر کم و بیش ایسے ہی رسوم و رواج، دیگر علاقوں میں بھی رائج ہیں کہ ایسے ہی ادب پاروں کی مثالوں سے مشرق و مغرب کا ادب بھرا پڑا ہے۔ انسان پرست معلمِ اخلاق تو کہہ سکتا ہے کہ زندگی کے سارے تجربات کی واردات انسانی ہوتی ہے اور اس میں انسانی آزادی کے ادب و جذبے کو برقرار رکھنا چاہیئے۔ مگر یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ جب دوسرے فرد کو بھی انسان سمجھا جائے۔ ہاں اگر فرد نہیں بلکہ معاشرہ یا خدا، اس دوسراہٹ کی تصدیق کریں۔ تو پھر یہ تعلق حیوانی تعلق میں منقلب ہو جاتا ہے کہ شادی کی رات، عورتوں کی ہذیانی ہنسی اور مردوں کے للچائے رویے، جنس کے وحشیانہ استعمال کی بازگشت معلوم دیتے ہیں۔

لڑکی کی جنسی تعلیم نہ ہونے کے باعث، سہاگ رات بہت سی لڑکیوں کے لئے خوف اور بد دلی کی رات نکلتی ہے۔ بہت سی لڑکیاں روتی ہوئی ماں باپ کے گھر واپس چلی جاتی ہیں۔ کچھ صرف لب چومنے کو حمل ٹھہرنے کے مترادف سمجھتی ہیں۔ سٹیکل نے لکھا ہے کہ ایک خاتون نے تو ہنی مون پر اپنے شوہر کے قطعی ضروری سلوک اور رویئے کو بھی، اپنی ناواقفیت کی بنا پر، پاگل پن سمجھ لیا تھا۔ ایک لڑکی دوسری سے، بغیر کسی شائبے کے شادی کرتی اور برسوں ساتھ رہتی ہے۔ ہرچند آج کل کی بہت سی لڑکیاں شادی سے پہلے ہی جنسی عمل سے آگاہ ہوتی ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی پہلی رات، علم کی منزل سے دوری کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہیولاک نے کہا ہے کہ شادی

کے بہانے زیادہ عصمتیں لٹتی ہیں، بہ نسبت دوسرے طریقوں کے۔ اس نے لکھا ہے کہ چھ دانشمند لڑکیوں کو جب انٹرویو کیا گیا تو ان سب کے لئے پہلا جنسی تجربہ، ایک صدمے کی طرح ان پر وارد ہوا۔ دو لڑکیاں تو بالکل ناواقف تھیں اور باقی جو سمجھتی تھیں کہ ان کو کچھ پتہ ہے وہ بھی جسمانی طور پر زخمی ہوئیں۔ عورت کو مرد کے ہاتھ میں، پورے معاشرے، خاندان، مذہب اور معاشرت کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیا جاتا ہے۔ اب مرد بھی تو اسی معاشرے کا حصہ ہوتا ہے کہ جس کے اپنے تضادات، احساساتِ کمتری اور قباحتیں ہوتی ہیں کہ جن کے باعث ممکن ہے کہ وہ شادی کی رات، خود کو بالکل بے جان محسوس کرے۔ ماہرِ نفسیات جینیٹ نے لکھا ہے کہ ایسے ہی ایک موقع کی شکایت کی بنا پر دعویٰ طلاق کے جواب میں، سسر نے میڈیکل سرٹیفکیٹ مانگا تھا اور بدقسمت داماد نے یہ اقرار کیا تھا کہ شادی کے ناگفتہ بوجھ نے اس کی قوتِ جنسیت صلب کر لی ہے۔ عورت کو تو حد سے زیادہ ادب بھی برافروختہ کرتا ہے۔ عورت، اسی مرد سے بہرحال نفرت کرتی ہے کہ جو عورت کی تکلیف کی قیمت پر، اپنی لذت کشید کرتا ہے۔ یہی نفرت ان مردوں کے خلاف بھی ہوتی ہے کہ جو پہلی رات، ان کے ساتھ جنسیت کرنے سے گریزاں یا ناکام رہتے ہیں۔ ہیلن ڈوش نے اپنے شوہروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اپنی ناتوانی کو چھپانے کے لئے، ڈاکٹر کو بلا کر کہتے ہیں کہ وہ ان کی بیوی کی مہرِ عصمت کھولیں۔ ایسے مردوں کے لئے بھی عورت نفرت محسوس کرتی ہے کہ جو یوں تو بہت بانگیں دیتے ہیں۔ مگر جب موقع ہو تو دخول تک کا عمل، ان کے بس کی بات نہ ہو۔

ایسی کشمکش اور کشاکش کے باعث، شادی کی پہلی رات گویا آزمائش کی رات بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہی رویے، عورت کو یخ زدگی کا شکار بنا دیتے ہیں۔ عورت، بیک وقت جنسی لذت حاصل کرنا اور انکار کرنا، چاہتی ہے۔ ہماری بہت سی عورتیں، مائیں اور دادیاں بھی بن جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی جنسی تلذذ سے ناآشنا رہتی ہیں ـــــ کنسے کے مطابق بہت سی بیویوں کی حسِ جنسیت بہت کم ہوتی ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ ان کے شوہر زیادہ جنسی عمل نہ کریں، جبکہ دیگر خواتین

متضاد رویہ چاہتی ہیں۔ مگر تجربات بتاتے ہیں کہ عورت میں عشق و جنس کی خواہش بے پناہ ہوتی ہے۔ یہ بات متضاد ہے مگر یہ اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ شادی کے حوالے سے جنسیت کو ترتیب کی گرہ بندیوں میں جکڑ کر مار دیا جاتا ہے۔

پہلے تجربے کی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اگر دونوں ساتھیوں کی رضامندی شاملِ حال ہے۔ عاشق، جس طرح، باہمی رضامندی اور آزادی کے جذبوں اور جسمانی قرب کی قوت میں خود کو مدغم کرتا ہے، تو ایسے ماحول میں نہ کوئی ذلیل ہوتا ہے۔ نہ بے عزت، نہ کوئی چھوٹا ہوتا ہے نہ بڑا۔ شادی تو اس وقت استحصال بنتی ہے۔ جب باہمی رواداری مفقود ہو جائے۔ پھر تو شوہر اپنی شوہرانہ ذمہ داری ادا کرتا ہے اور بیوی نیچے لیٹنے کی اپنی ذمہ داری پوری کرتی ہے۔ شادی اپنے معمولات کی افزونیت میں بیوی کے ذہن سے گناہ کا تصور فرد کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیویاں، شادی کے پہلے سال، مرد کی بہت شکر گذار ہوتی ہیں۔ سٹیکل نے کہا ہے کہ وہ بیویاں کہ جو اپنے شوہروں سے نجات چاہنے کے باوجود حاصل نہیں کر سکتی ہیں، وہ دراصل اپنے شوہروں سے جنسی طور پر آسودہ ہوتی ہیں۔ ہر چند احساس اس کے بالکل متضاد ہوتا ہے۔ بہر حال اس مرد کے ساتھ تاحیات رہنا کہ جس کے ساتھ وہ قطعی ناآشنا تھی کہ اس کی پوری عشقیہ زندگی کا انحصار، اس کے ساتھی کی شخصیت پر ہوتا ہے۔

یہ بالکل غلط ہے کہ وقتی طور پر مفاہمانہ شادی، محبت بھی پیدا کر سکتی ہے۔ یہ بھی بالکل فضول بات ہے کہ دو افراد کہ جو عملی طور پر معاشرتی اور اخلاقی مفادات کے تحت اکٹھے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کو جنسی لطف تاحیات فراہم کریں گے۔ یہاں یہ بات بھی لائقِ ذکر ہے کہ محبت کی شادی کا بھی یہی انجام ممکن ہے کہ اول تو تخیلاتی عشق جو نوجوان لڑکیاں محسوس کرتی ہیں۔ وہ ضروری نہیں کہ جنسی مفاہمت اور تسلیمیت کا رُخ اختیار کرے۔ علاوہ ازیں اس کے بچپنے کے خواب، جذبات و دیگر احساسات، روزمرہ زندگی کے حقائق کا سامنا نہ کر سکیں، ہر چند کہ دونوں کے درمیان عشقیہ جذبات اب بھی حاوی ہوں۔ اگر جنسی کشش ہو بھی تو وہ ہنی مون اور شادی

کے کچھ عرصے بعد فرد ہونے لگتی ہے۔ ہر چند ایک دوسرے کی ضرورت، غایت، محبت، سب کچھ جذباتی تعلق کے لئے بہت مفید اور قربت کے لئے لازمی رہتا ہے۔ جہاں کہیں بے یقینی، بے اعتمادی اور ناگواری کا عالم آیا، یہ وحدانیت اور تعلق کا سماں، ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

شوہر اور بیوی میں ایک دوسرے کو تسخیر کرنے کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ تو ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اگر وہ اظہارِ عشق کرتے بھی ہیں تو ایک طرح کے احساسِ ندامت کے ساتھ، جنسی عمل، ان کے لئے لطف کم اور ماسٹر بیشن زیادہ ہوتا ہے۔ اب جذباتی ردِ عمل بھی اور رنگ اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر شوہر کسی سے بھی ازراہِ لطف بات کرے تو بیوی اسے حق تلفی سمجھنے لگتی ہے، بالکل اسی طرح کہ شوہر کسی اچھی ہمسائی کے گھر آنا جانا شروع کر دے تو بیوی اس کا انڈرویئر تک چیک کرے گی۔ جہاں تک شوہر کا تعلق ہے تو وہ تو بیوی کی رائے لئے بغیر اپنا کام نکال لیتا ہے۔ یہی صورتِ حال شوہروں کو جنسی عمل کے وقت کسی اور عورت کا اور بیوی کو کسی اور مرد کا تصور لا کر، باہمی ربط پیدا کرنے پہ مجبور کرتی ہے۔ سٹیکل نے لکھا بھی ہے کہ ایک ۲۵ سالہ خاتون اسی وقت جنسیت محسوس کرتی تھی۔ جب وہ یہ تصور باندھتی تھی کہ ایک مضبوط بدن بوڑھا شخص اُسے بانہوں میں جکڑے ہوئے ہے۔ شوہر بھی ایسے ہی تصور میں غلطاں، بیوی کی جگہ، ایک رقاصہ کی ٹانگوں میں خود کو پھنسا محسوس کر کے اور خیالوں میں اس لڑکی کی چھاتیوں کو ہاتھ میں تھامے کہ جس کی تصویر اُس نے گھنٹوں دیکھی تھی۔ اپنے جنسی عمل کی تکمیل کرتا ہے۔ بقول سٹیکل، شادی مزاحیہ طرزِ فکر اور محض اداکاری کو بہت حد تک جنم دیتی ہے۔ پھر دونوں افراد میں عجیب و غریب جذبات اُبھرنے لگتے ہیں۔ مرد، سوچتا ہے کہ اس کی بیوی کے ساتھ کوئی اور محوِ جنس ہے۔ جبکہ بیوی میں اذیت طلبی کی منزل، اِس خواہش کو جنم دے سکتی ہے کہ اُسے کوئی مارے۔ مجھے ایک خاتون کے بارے میں علم ہے کہ وہ دن میں بڑی تحکمانہ اور معمولات کی توقیر کی خاتون تھیں۔ مگر رات کو وہ چاہتی تھیں کہ وہ اُسے مارے، اس کے شوہر نے اسی خواہش کو دھتکارا

تو وہ خاتون برہم ہوئیں اور آخر کو اس کے شوہر کو خاتون کی ضد ماننی پڑی۔

حقیقت یہ ہے کہ جسمانی عشق نہ بذات خود مکمل ہوتا ہے، نہ یہ آپ کی تکمیل کرتا ہے۔ نہ یہ آپ کے زندہ رہنے کا مقصد ہے۔ بلکہ یہ تو زندگی کا ایک باب ہے۔ جو بہرحال بہت اہم ہے۔

اس لئے سرمایہ دار معاشرہ، لڑکی کو جو کچھ دیتا ہے۔ وہ بہرحال عشق نہیں ہوتا ہے۔ درمیانہ درجے کے معاشرے میں مناسب کھانے پینے رہنے سہنے کے بندوبست کو زندگی کی معراج سمجھا گیا ہے۔ زمیندار طبقے میں مستقبل کو درخشاں بنانے سے زیادہ اسی نفسیاتی درویست پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ ماضی کس قدر شاندار تھا۔ تاکہ حال میں وہی زمانہ ہی قائم رہے۔ مگر ایک اوسط درجے کا فرد جو خواہش اور جذب دونوں کی کشش سے ناآشنا ہوتا ہے وہ بے مقصد زندگی کے شب و روز کاٹتے ہوئے موت کے نزدیک ہوتا چلا جاتا ہے اور ایسی ظاہری خاموش زندگی کو لوگ خوشی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ جھوٹی دانشوری آج کے زمانے میں ناقابلِ قبول ہے۔ آدمی سے عمل کا تصور وابستہ ہے۔ اس کا کام پیداواری قوت میں اضافہ کرنا ہے۔ اس کا کام ہے کہ وہ حال اور مشکلات سے لڑے اور ترقی کرے تاکہ مستقبل کو تسخیر کرے۔ مگر روائیتی شادی عورت کو بھی اسی انداز میں آگے بڑھنے کی نہ اجازت دیتی ہے اور نہ دعوت بلکہ عورت کو اپنے حال میں جوں کا توں برقرار رکھنے کی تلقین کرتی ہے۔ اسی جوں کے توں کے عالم کو مسرت کا ماحول کہا جاتا ہے اس کی دنیا گھر کی چار دیواری میں مقید اور اس کا علم اس کے گھر والوں اور رشتہ داروں کی شکلوں تک محدود ہوتا ہے۔ مرد کو اس عمل کے جاری رکھنے کا جواز اسی شکل میں نظر آیا کہ اس نے اپنی ساری قوت اور انضباط کا سرچشمہ گھر میں آرام دینے والی عورت کو قرار دیا اور یوں اُسے گھر کی ملکہ کے خطاب سے نواز کر چین کی بنسی بجائی۔

خوشی کا تصور ہمیشہ گھر سے وابستہ رکھا گیا ہے۔ گھر چاہے کیسا ہو، محل ہو یا جھونپڑا۔ گھر دنیا سے الگ ہونے اور محفوظ ہونے کا دوسرا نام ہے، گھر کی چار دیواری میں خاندان کے

افراد اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ رہتے، پرورش پاتے اور زندگی میں نسل در نسل آگے بڑھتے ہیں۔ ماضی پرانے فرنیچر اور یادگاری تصاویر کی شکل میں محفوظ کیا جاتا ہے اور یوں آنے والے مستقبل کے خواب بن جاتے ہیں۔ ان تہذیبوں میں جو کہ ملکیت کے تصور سے وابستہ ہوں وہاں کے ادب میں بھی گھر اور اس کے تعلقات کی تفاصیل ملتی ہیں۔ صبر و تحمل، گھرداری، مستقبل کی دور بینی، خاندان کا وقار، محبت، بچت اور کفایت اور اپنی زمین سے محبت کے فلسفے جا بجا بکھرے ہوتے ہیں۔

مگر عورت کے لئے پاگل پن کی حدود تک یکسانیت کے ساتھ ایک ہی انداز کے روزمرہ کو قبول کرتے ہوئے زندگی گزارنا یعنی روز جھاڑ پونچھ، برتن دھونا، کھانا پکانا، خرچہ پورا نہ ہونے کے باوجود پورا کرنے کے لئے فکر مند ہو کر بے سود خود کو پریشانی میں مبتلا کرنا۔ ایسی عورت سوچتی ہے کہ سارے دروازے، کھڑکیاں، چٹخنیاں، پردے، پچھے اور برتن اس کی طرح سوچتے ہیں اور اس کے سوچنے کے انداز کے تابع ہیں۔ گھر میں، بچہ بھی داخل ہو تو دیوانہ وار چیخ کر کہے گی۔ پیر صاف کرو، ہاتھ دھوؤ، چیزوں کو ہاتھ نہ لگاؤ، گویا گھر نہ ہوا، کوئی پریڈ گراؤنڈ یا چڑیا گھر ہوا کہ ہدایات کے علاوہ عمل ہو ہی نہ سکے۔ وہ گھر کے افراد یا جذبات سے زیادہ اپنی گھڑی کی سوئی کے مطابق معمولات میں منہمک اور ان پہ زیادہ توجہ دیتی نظر آتی ہے۔ وہ دروازے کھڑکیاں اس لئے بند رکھتی ہے کہ دھوپ سے پردوں کے رنگ اُڑ جاتے ہیں اور کھلے دروازوں سے گرد اندر آکر چیزوں کو گندا کر دیتی ہے۔ وہ ہر شخص اور ہر موجود فرد سے تلخ لہجے میں گفتگو کرتی ہے اور کبھی کبھی طبیعت کی یہ تلخی اور تیزی قتل کے عمل میں بھی منتج ہوتی ہے۔

یہ رویہ شکست خوردہ اور سال خوردہ ایسی عورتوں کا ہوتا ہے کہ جن کے ساتھ دھوکہ اور فریب کیا گیا ہو۔ جن کی محبت اور خلوص کو ڈھال بنا کر مردنے اپنے مقاصد پورے کئے ہوں اس کے تلخ نتائج کے باعث عورت انسانی رشتوں سے زیادہ وہ مادی رشتوں یعنی میز، کرسی، پردوں

کو قریب تر سمجھنے لگتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اس قسم کی صفائی کا وحشیانہ عمل ہالینڈ کی عورتوں میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ جبکہ بحیرۂ روم میں عورتیں پانی کی بہتات ہونے کے باوجود گندگی اور غلاظت میں رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ کیونکہ وہاں جسم کے قرب کی لذت کو تمام دوسری آسائشوں سے افضل قرار دیا جاتا ہے۔

عورتوں کے کھانا پکانے، سبزی چھیلتے ہوئے باہمی دلچسپی کے امور پر تفصیل سے بات کرنا۔ مارکیٹ سے سودا خریدتے ہوئے، باہمی رازداریوں سے پردے اٹھانا اور پھر دوکاندار سے طویل گفتگو کے بعد قیمت کم کروا کر اشیاء خریدنا، گھر کے مرد سے گفتگو کرنے سے زیادہ لذت آمیز اور مفاہمت آمیز معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح اچھا کھانا پکانا، کیک بنانا، پڈنگ بنانا، ذات کی تکمیل اور تشخص کی شکل معلوم ہوتی ہے مگر ایک کام کرنے والی عورت کو ایک گھر بیٹھنے والی عورت کے رویے، کام کے کرنے کی رفتار اور وقت کی تقسیم اتنی مایوس کن بے مقصد اور بے لذت لگے گی کہ وہ فوراً اپنے انداز میں کام کر کے رعب جمائے گی کہ تسخیر انسان اور تسخیر کائنات کے لئے میرے جیسے ہنر مند اور اندازِ کار کو اپناؤ تو کامیاب ہو گی۔

گھر کا کام تسلسل رکھنے کے باعث نئے پن کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں بوریت کو بہت دخل ہو جاتا ہے۔ ایک گھر دار عورت کو ہفتے میں کم از کم چونتیس گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام بچوں کی نگہداشت اور اس ذمہ داری کے علاوہ ہے کہ جو وہ اگر گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے اپنے ذمے لے لے۔ پھر وہ کام مکمل کر کے ان کی ستائش اور اپنے کئے ہوئے کاموں کی حوصلہ افزائی چاہتی ہے۔ جبکہ خاندان کا ہر فرد، ان سب کاموں کی ادائیگی کو اس کی ذمہ داری اور فرائض کی ادائیگی کا حصہ سمجھ کر اس لئے جان بوجھ کر نظر انداز کرتا ہے کہ اگر کچھ کہا تو ان سب کے بیکار رہنے کا پردہ چاک ہو جائے گا اور یہ احساس جرم گھر کے ہر فرد کو، اس ذمہ دار عورت سے روگردانی کرنے اور چشم پوشی کرنے کا اس قدر عادی بنا دیتا

ہے کہ وہ اگر کسی وقت بیمار ہو یا پھر گھر کے کام کرنے کے قابل نہ ہو تو اس وقت بھی وہ احساسِ خوف سے اس کی طبیعت اس وقت تک نہیں پوچھتے کہ جب تک کہ گھر کے کام نمٹ نہ جائیں۔

گھر میں مرد داخل ہوتا ہے۔ تو صفائی، ستھرائی سلیقہ دیکھ کر اس صورتِ حال کو معمول کا حصہ جانتا ہے۔ ہاں جب گھر میں ذرا بھی بدنظمی یا بدسلیقگی ہو تو اُسے عورت کے بلا تامل پھوہڑ پن اور بدنظم طبیعت کا شاخسانہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ مرد کو کھانے کی لذت میں عورت کی صحت سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کی ساری محبت کھانے کی خوشبوؤں میں سمٹ آتی ہے۔ بچے اور شوہر کو کھانے میں لذتوں کے خزینے ملتے ہیں۔ اور اس وقت وہ اس فکر سے بھی آزاد ہوتے ہیں کہ جس نے کھانا پکایا ہے وہ بھی اس خوشی میں شریک ہے کہ نہیں کہ وہ یہی حسرت لئے کھانے کے ختم ہونے کا منظر دیکھے جا رہی ہے کہ کوئی اُسے بھی کھانے کا شریک ہونے کی دعوت دے۔ بلکہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ کھانا ختم کر کے سب یا پھر شوہر اچنبے سے پوچھتا ہے اُسے تم نے نہیں کھایا۔ کیا پکاتے ہی کھا لیا تھا!

فرش صاف اور مضبوط رکھنے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انسانوں کے جذبوں اور تعلقات کو مستحکم کیا جائے کہ خانسامے کی کوششیں، اس مستقبل کی جانب نشاندہی کرتی ہیں کہ جس میں انسانی تعلقات، منفی سطحوں پر آجاتے ہیں۔ عورت کے خانساماں بننے سے صرف میز کے گرد بیٹھ کر لذت حاصل کرنے والوں کا بھلا ہوتا ہے۔ خاتون، گھر والوں کے بھوکا نہ رہنے پر پریشان ہو جاتی ہے، اس قدر پریشان ہوتی ہے کہ بندہ سوچتا ہے کہ کھانا، گھر والے کے لئے بنا ہے کہ گھر والے کھانے کے لئے۔ اسی سلوک کا اظہار گھر والی کے اس رویئے سے بھی ہوتا ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ کمانے والا، پائی پائی گھر کی آرائش و زیبائش پہ خرچ کرے اور خرچ کی تفصیل، اس دائرے میں ہو کہ جو خاتونِ خانہ مقرر کرے۔

روایتی مینی مون کا مطلب بھی اسی دوعملی پر پردہ ڈالنا ہوتا تھا کہ اُسے روزمرہ زندگی کی روایت اور عمومیت سے باہر نکال کر، عورت کو زمانے، معاشرے

وقت اور حقیقت کی زنجیروں سے آزاد کر کے، کچھ دن ایسی زندگی کے خواب دکھانے کہ باقی ساری عمر ان ہی دنوں کے آنے کے انتظار میں بتائی جا سکے۔ لڑکی کے اپنے میکے سے روابط زیادہ رکھے جاتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی دوری پیدا ہو۔ تو لڑکی بہت تکلیف اور خلا محسوس کرتی ہے۔ اگر اس نے آزاد رہنے کا کچھ حوصلہ پیدا کیا ہے یا پھر میکے کی اجارہ داری قائم ہے تو پھر اس میں ذرا سکون اور طمانیت ہو گی، ورنہ عام طور پر لڑکی خاندان سے الگ ہونے کے خیال پر بہت پریشان ہوتی ہے۔ صرف محبت سے بھرپور زندگی، اس کی زندگی میں آسودگی کی خوشبو لا سکتی ہے۔ ورنہ تو وہ نئے گھر میں آکر اسی طرح بے چین ہوتی ہے۔ جیسے لڑکی ماہواری کے وقت بے چین ہوتی ہے۔ عصمت کے لٹ جانے کا خیال اس کو اور بھی بے چین کرتا ہے کہ نوجوانی اور بلوغت میں بغاوت، شادی کے الزام پر ختم ہوتی تھی، اب شادی کے بعد، راستہ بھی بغاوت کا اور کوئی نہیں ہے۔ اب وہ اپنی ماں کی طرح وہی کرتی رہے گی جو گھر میں ہوتا رہا ہے اور اب وہ سوچتی ہے کہ اس گھر اور چار دیواری، ذمہ داری اور مرد کے لئے میں نے اپنی ساری تمنائیں سنبھال کر رکھ لی تھیں۔

اگر اس کا شوہر پختہ ذہن اور صاحب اختیار بھی ہو، تب بھی وہ خود کو اس گھر میں صرف جنسی فعل ہونے پر اجنبی محسوس کرتی ہے۔ شادی مرد کے لئے مسئلہ بن جاتی ہے۔ گھر میں بہنوں اور دوسرے بھائیوں سے آزادانہ اختلاط نہ رکھنے کے باعث، وہ کسی کلب، سکول، کالج، ورکشاپ، ٹیم یا گروہ سے خود کو منسلک کر کے۔ مصروف کرتا ہے اور وہ اکثر ایسی تنہائی کے عذاب کو اپنے اوپر سے اتارنے کے لئے، شادی کرتا ہے۔ مگر دنیا میں صرف دو افراد باہم مل کر، ایک نئی دنیا کی تخلیق نہیں کر سکتے ہیں۔ بیوی اپنی تابعداری اور باہمی اعتماد کے باوجود، اپنے شوہر کی تنہائی کے آشوب کو ختم نہیں کر سکتی ہے۔ بلکہ کسی حد تک بڑھا ہی دیتی ہے۔ میاں اور بیوی کے درمیان تعلیم و تربیت اور مقام پرورش

کا فرق بھی، ان کے درمیان اجنبیت کو بڑھاتا ہی ہے۔ لڑکی اپنی معصومیت اور اجنبیت کی دنیا میں پرورش پانے کے باوصف، اپنے پاس کوئی اثاثۂ تجربہ نہیں رکھتی ہے۔ جبکہ لڑکا، زندگی کے کم و بیش تجرباتِ عمل رکھتا ہے۔ کچھ مرد، اپنے تجربات کو روشنی کا مینار بناتے ہیں۔ ویسے تو آج کل لڑکیاں بھی خبردار اور خود آگاہ ہوتی ہیں۔ مگر اپنے شوہروں سے بہت کم عمر ہوتی ہیں۔ اس نکتے پر عام طور پر اچھی طرح سوچا اور لکھا بھی نہیں گیا۔ کئی مثالیں ایسی ہیں کہ جہاں عورت بس ایک بچّے کی طرح ہوتی ہے کہ واقعی مرد سے بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ یہاں عورت، مرد کو بیوی کی طرح نہیں بلکہ بچّے کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ ویسے لڑکی بھی ایک نئے رہنما کو میکے سے نکل کر یوں پناہ گاہ سمجھتے ہوئے، خود کو بچہ ہی سمجھنا، اچھا سمجھتی ہے۔ مگر پھر بھی عورت پن کی جانب راغب نظر آتی ہے، بڑی عمر کے شوہر ان کو اطمینان بخش سلوک فراہم نہیں کر سکتے ہیں۔

جب عورت اور مرد کی عمر کا فرق بہت کم ہو، یہ فرق تو رہتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی کی پرورش مختلف صورتوں اور حالتوں میں ہوئی ہے۔ یہی فرق، ان دونوں کے درمیان تنازعات کو اُبھارتا ہے۔ چونکہ شادی کا بالواسطہ مطلب، عورت کو زیرِ دست اور تابع کرنا ہوتا ہے، اسی لئے عورت کو شوہر کو حاکم، رہنما، استاد، روٹی اور پناہ دینے والا اور باپ کی جگہ عزت دینے والے مرد کا پیکر، دینا پڑتا ہے۔ وہی اخلاقیات، معاشرت اور معاشیات کا خالق اور ساتھ ہی ساتھ بدن کے ہر بُنِ مو کا رازداں بھی ہوتا ہے۔ اس طرح مرد، باپ اور عاشق دونوں رویوں کا امین ہوتا ہے اور بیوی کو سپردگی ہی میں کل عافیت ملتی ہے۔ شادی شدہ زندگی میں جذباتی عشق بہت کم ہوتا ہے۔ ایک عورت کسی مرد کے ساتھ افلاطونی عشق کر سکتی ہے۔ مگر جس کا وہ اس قدر احترام کرتی ہو۔ اس کے بازوؤں میں جا کر وہ مکمل یخ بھی ہو سکتی ہے۔ وکٹر ہیگو کی بیوی آڈیلے کا یہی احوال رہا۔ ہاں ایک نوجوان بیوی اپنے جذبات کی بھی تسلیمیت کی خو نہیں ڈالتی ہے۔

اپنے شوہر کی عزت کرنا اور اس کو خوش رکھنا، اس پر معاشرے اور فرد کی جانب سے عائد کردہ ذمہ داریاں ہیں کہ جن کو پورا کرنا، اس کا فریضۂ اوّل و آخر سمجھا جاتا ہے کہ گھر، معاشرہ اور خاندان اس سے یہی توقع رکھتے ہیں۔ عورت اپنی شادی شدہ زندگی کا آغاز بڑے اندازوں ہی سے کرتی ہے۔ وہ خود کو باور کراتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی بڑی عزت کرتی ہے۔ یہی جذبہ اُسے بہت خود غرض، حاسد اور غیر مطمئن بیوی کا کردار دیتا ہے۔ وہ مسلسل اپنے شوہر کے اپنے ساتھ رہنے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی خواہاں رہتی ہے۔ وہ ان ہی جذبوں اور محبت کے حصار میں کبھی اپنی بزدلی، کبھی انا، غرور، ظاہری رکھ رکھاؤ یا اخلاقیات کے تار و پود کے باعث، مقید رہتی ہے۔ شوہر اپنی تربیت و تعلیم و تجربے کی بنا پر خود کو بہتر مہذب اور عقلی طور پر برتر ثابت کرنے کا عمل بھی اختیار کرتا ہے۔ وہ سیاست قانونی موشگافیوں، سماجی تنظیموں اور منطقی استدلال کے ہیولوں کو سمجھتے ہوئے، خود کو بہتر اور تجربہ کار فرد اور شہری سمجھتا ہے۔ جبکہ بیشتر خواتین کو ان تجربات و مشاہدات کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اسی جواز کو بہت سے شوہروں نے بات کا محور اپنی جانب کرنے کیلئے استعمال کیا۔ مرد کے ہاتھ میں تو منطق، تشدّد کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ تجربہ کار اور خود آگاہ مرد تو عورت کو شریکِ کار بھی نہیں کرتا، بلکہ اس کی رائے کو کسی قسم کی اہمیت بھی نہیں دیتا ہے۔ عورت یہ سلوک دیکھ کر، اپنی رائے کو بنیادی طور پر ناقص اور بے وقعت سمجھ کر، مرد کی رائے کو ہی حتمی اور آخری فیصلہ سمجھنے لگتی ہے۔ وہ غصے میں ہو تو یا تو خاموشی اختیار اور زیادہ کر لیتی ہے، یا رو پڑتی ہے یا پھر تشدد پہ اُتر آتی ہے اور کوئی چیز اٹھا کر مار دیتی ہے۔

مرد فیصلہ کرنے اور ذمہ داری اُٹھانے کو مردانگی متصور کرتا ہے۔ اس کا عمومی نعرہ ہوتا ہے کہ بس تم مجھ پر اعتماد کرو۔ مجھے فیصلہ کرنے دو۔ پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی سانڈ کو میدان میں مقابلے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ مرد، عورت سے بھی اسی قسم کی تیاری توقع کرتا ہے۔ اس لئے تو ہینگر پر کوٹ اور کپڑے لئے، ہاتھ میں جوتے لئے،

چائے کی پیالی لئے عورت کا مرد کا ناشتہ کرنے اور تیار ہونے کو منتظر رہنے کو مرد اپنی وجاہت و مردانگی کا حصہ سمجھتا ہے۔ وہ گھر آکر دفتری فتوحات، دوستوں میں اپنی عقلمندی کے اظہار اخبار میں شائع شدہ خبروں اور ان پر تبصرہ، بڑے ذوق و شوق اور اس اعتماد کے ساتھ کرتا ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے، وہ کسی دوسرے کے علم کی بات نہیں۔ شادی، مرد کے لئے ایک مملکت کے قیام کا اعلان ہوتی ہے۔ بلکہ جو محرومیاں، بچپن میں رہ جاتی ہیں۔ اُن کے ازالے کی شکل بھی، شادی کے بعد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عموماً کارکن ماؤں کے بچے اپنی شادی کے بعد بیوی کے کام کرنے کو پسند نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں ساری عمر خود کھانا گرم کرتے اور بھاگم بھاگ ناشتہ کرتے گزری ہے۔ اب تو اطمینان سے ناشتہ ملنا چاہئیے۔ عورت اور مرد کی مساوی تعلیم ہو تب بھی، مرد خود کام کرنا پسند کرتا ہے اور عورت کا کام چھڑا دیتا ہے۔ مرد کا بس چلے تو وہ عورت کو اپنی اجازت اور وجود کے بغیر سانس بھی نہ لینے دے۔

بلزاک نے کہا تھا کہ بیوی وہی کچھ ہوتی ہے کہ جو کچھ اُس کا میاں اُسے بناتا ہے۔ مگر آگے چل کر وہ اپنے اسی مقولے کی نفی کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ایک مرد چاہے کتنا ہی ستمگار کیوں نہ ہو۔ نہ وہ بیوی کے مذہبی نظریات بدل سکتا ہے نہ اس کے توہمات کو ضعیف کر سکتا ہے۔ وہ کبھی آنسوؤں کے ذریعہ اور کبھی دھمکیوں کے ذریعہ کام نکالنے پر مجبور ہوتی ہے۔

اپنے ہی مطالب نکالنے اور طوطے کی طرح اپنی ہی رٹ لگنے کے باوجود، یہ ہٹ دھرمی اس کو خاوند کو بہتر طریقے پر سمجھنے سے معذور رکھتی ہے یا پھر اس کے برخلاف یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ، مرد کی سمجھ اور انا کے حصار سے بالا تر ہو کر اپنے کردار کو راسخ اور پختہ بنائے۔ یہ اس لئے بھی ممکن ہے کہ وہ شاید جنسی طور پر اُسے آسودہ کرنے میں ناکام رہا ہو یہ اس لئے بھی ممکن ہے کہ وہ اس پر حکومت کرنی چاہتا ہے اور وہ انتقاماً ایسا کرتی ہے۔ وہ جان بوجھ کر شوہر کے عقائد اور اصولوں سے انحراف کرتی ہے۔ وہ ماں، بھائی، باپ اور کسی مردانہ رشتے کے اختیارات کو اپنی ذات کا حصہ سمجھتی ہے۔ بحث اور اختلاف میں کوئی مثبت قدر نہ

ملنے کے باعث، وہ شوہر کی ہر بات سے انکار اور اس کو مجروح کرنے کی ہر حرکت کو لازمۂ زندگی سمجھ لیتی ہے تاکہ اسی طرح شوہر کو احساس کمتری میں مبتلا کر سکے۔ اگر اس کے پاس ذرائع بھی ہوں تو وہ عملی طور پر اپنے شوہر کے فیصلوں کے خلاف اقدامات کر کے دکھانے کا عمل بھی کرے گی اور یوں اخلاقی اور عملی طور پر قطعی انفرادیت کا مجسمہ بن کر ظاہر ہونے پر ایمان رکھے گی۔

جہاں وہ مرد کو ذہنی طور شکست نہیں دے سکتی ہے۔ وہاں وہ جنسی طور پر اس کو شکست دینے کا رویہ اختیار کرتی ہے۔ وہ شوہر کو ہم آغوشی کا شرف بھی نہیں دے گی۔ جب تک کہ اسے وہ کچھ نہ مل جائے کہ جو وہ چاہتی ہے یا اسے ذلیل کرے گی قطعی طور پر جنسی یخ بستگی دکھا کر۔ یا پھر کسی اور مرد سے شوہر کے سامنے التفات کا ظاہر کرے گی کہ وہ حسد میں مبتلا ہو اور خود کو بے عزت محسوس کرے، اگر وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تو پھر اپنے اندر ہی اندر ایک ایسی عورت کو ظاہر کرنے کا منصوبہ بناتی اور کھولتی رہتی ہے۔ بہت سی عورتیں، مردوں کو انگیخت کرنے، جلانے اور ذلیل کرنے کے گر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کر کے استعمال کرتی اور بدلتی رہتی ہیں اور اپنے شوہروں کے چغدپن پر مل کر خوب ہنستی اور ان کا مذاق اڑاتی ہیں۔ یہ عورتیں اپنے لئے ایک مفروضہ بنا کر اس پر عمل پیرا بھی ہوتی ہیں اور وہ ہے یہ کہ وہ قطعی طور پر جنسی لذتیت محسوس نہیں کرتی ہیں۔

کچھ خواتین اظہار عشق میں بے حس، گفتگو میں طنز رو، اور عمل میں خوفناک ہوتی ہیں اور ہر طور اپنے شوہر کو کمزور، کم تر، کم حیثیت اور کم عقل ظاہر اور ثابت کرتی ہیں۔ یہ عورتیں، مرد کی ذات قطعی فنی نہیں کرتیں۔ بلکہ یہ اس طرح مرد کے روایتی طرز عمل کو بدلنے کے لئے انتہائی رویہ اختیار کرتی ہیں۔ اذیت پرست عورتیں تو مرد یا بچے کی بیماری کو بھی اپنی فتح و کامیابی کا شاخسانہ سمجھتی ہیں۔ مرد کا کمزور ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جانا، ان کی انا تسکین کا باعث بنتا ہے۔ وہ مرد کو اٹھانا، بٹھانا، بالکل اسی طرح کرتی ہیں۔ جیسے گھر کے ساز و سامان کو اٹھانا، رکھنا اور

اس پر اظہارِ مسرت بھی کرتی ہیں کہ وہ اب اس کا قطعی طور پر محتاج ہو گیا ہے۔

یہ عورتیں، مرد کو اپنے وجود کے اظہار کا آئینہ نہیں، بلکہ محض گوشت پوست کا وہ ٹکڑا بنانا چاہتی ہیں کہ جو کٹھ پتلی کی طرح اُن کی خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کرے۔ وہ اُسے کمرے میں بند کر کے، گھر کا سارا انتظام خود چلانے میں مسرت محسوس کرے گی۔ یہ تضاد اُسی حد تک بڑھ سکتا ہے کہ تعلقات قطعی طور پر شکستہ محسوس ہوتے ہوئے بھی محض جاری رکھے جاتے ہیں۔

شوہر کو قابو میں رکھنا بھی ایک فن ہے۔ اس کے سامنے دوسری دلفریب چالاک اور محض حسین و دلکش نظر آنے والی عورتوں کی جانب، جب اس کا شوہر زیادہ التفات دکھاتا یا دلچسپی لیتا محسوس ہوتا ہے، تو پھر وہ عورت بھی شوہر کے قرب کو حاصل کرنے کے لئے ویسی ہی حرکات اور آرائش کا سوچنے لگتی ہے وہ بچیوں کو شوہر کی پسند کے مطابق کپڑے پہناتی ہے، پکاتی ہے جس طرح شوہر پسند کرتا ہے گھر سجاتی ہے۔ وہ کرتی ہے وہ شوہر کو اچھا لگے، گویا یہ سب کچھ اس کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں خود کو جزوِ زندگی اور لازمہ بنانے کے لئے کرتی ہے۔

ان تمام باتوں سے بڑھ کر عورت کو مرد کو راہِ راست پر لانے کا فریضہ بھی سونپا جاتا ہے۔ اس کی کمزوریوں کو شناخت کرنا اور ان پر بوقتِ ضرورت داد و تحسین کے ڈونگرے برسانا' اس سلسلے میں ذرا زیادہ محتاط رویّہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ شوہر کو نہ کھلی چھٹی دی جائے اور نہ اُسے بکری کی طرح باندھ کر رکھا جائے۔ اگر عورت بہت انکسار اور لاڈ کے ساتھ، شوہر کے ساتھ پیش آتی ہے، تو پھر وہ برابری کا جذبہ اور اُس سے لڑنے کا جذبہ ڈھونڈنے باہر جائے گا۔ اور ممکن ہے اسے طلاق دے کر دوسری عورت کو بہتر خیال کرے۔ دوسری طرف اگر عورت اُسے ہر قسم کی آزادی سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور اس پر نظر رکھنے کے علاوہ جو کسی کرتی ہے تو یہ دیکھ کر تو وہ لامحالہ بغاوت کرے گا۔ یعنی رشتے کا یہ عمل دوہری چالاکی کا متقاضی ہے۔ ایک دفعہ چوری کی ہے، یہ ظاہر کرو۔ پتہ ہی نہ چلا۔ ہاں اگر دوسری دفعہ پھر یہ عمل دہرایا جائے تو پھر اسی چالاکی کا بھرم کھولو۔ یعنی یہ کہ چھٹیوں پر فوری طور پر جانے کا پروگرام بنالو۔

یا پھر جیسا کہ بزرگوں کا کہنا ہے کسی کم خطرناک قسم کی خاتون سے تعارف کروا دو۔ اگر یہ سب کچھ رائیگاں نکلے ۔ تو پھر عورت، رونے، چیخنے، چلانے، واویلا کرنے اور خودکشی کرنے کی جانب مائل ہو گی کہ یہ سب باتیں بھی بے راہ اور بے توجہ شوہر کے لئے بھی بے اثر اور لاحاصل رہیں گی۔ ایسے لمحات میں آنسو اور بہادری کے ساتھ مسکراہٹ کا وہ نسخہ بے بدل چاہئیے کہ پتھر بھی پگھل سکے۔

یہ بڑا جانگسل مرحلہ ہوتا ہے۔ اندر سے آپ نفرت کا لاوا بن جاتے ہیں، مگر دوسری طرف مرد کی انا کے لئے لمحہ تپاں بنے ہوتے ہیں، اس حد تک کہ اس کو بھی دھوکے میں رکھ کر، اپنی مرضی کرنے کی راہ اختیار کرنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر زیادہ تر عورتیں ایسا کرنے سے گریز کرتی ہیں کہ انہیں اپنی شادی کا یہ معاہدہ اس طرح کمزور پڑتا محسوس ہوتا ہے۔ اگر عورت کے پاس کوئی با مقصد پیشہ یا مہارت، کوئی قانونی علم۔ یا کوئی ایسا رشتہ دار نہ ہو کہ جسے اپنے آڑے وقت کے طور پر استعمال کرے تو اس کے پاس سوائے اپنے آدھے نام اور شوہر کے پورے نام کے اور ہوتا کیا ہے۔ وفاداری اور دوستی، میاں بیوی کے درمیان صرف ایک بنیاد پر قائم رہ سکتی ہے اور وہ بنیاد ہے کہ دونوں اپنے معاملات اور دوستیوں میں آزاد ہوں اور ان کا احترام بھی کرتے ہوں۔ چونکہ معاشی "کل" مرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس کے لئے یہ قدرتی امر ہے کہ وہ آمرانہ حرکات کرے اور یہی حرکات، عورت کو بغاوت پر اکساتی ہیں۔

شادی شدہ زندگی کی آلائشوں اور دلوں کی کدورتوں سے تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا ہے۔ البتہ شادی کے ادارے کے معتقد اپنے حوالے کے لئے یہ جواز لاتے ہیں کہ ایک دوسرے پہ اعتماد نہ کرنے کی فضا اور انتشار، صورتِ حال کو ضعیف بناتا ہے۔ ٹالسٹائی نے "وار اینڈ پیس" میں پیئر۔ نتاشہ کا عشق دکھایا ہے۔ ایک خوبصورت اور جنسی کشش والی لڑکی، مگر شادی ہوتے ہی یہ ان وہ عادات، وہ ماحول، وہ لباس اور وہ ساری دلچسپیاں چھوڑ دیتی ہے اور ساری توجہ، اپنے شوہر کی جانب مبذول کر دیتی ہے۔ وہ ہمارے عمومی گھرانوں کی بیویوں کی طرح

بیوی کم اور آیا زیادہ بن جاتی ہے۔ پیری یہ حال دیکھ کر نتاشہ سے اپنی توجہ، بزنس اور خاندان کی جانب مبذول کر لیتا ہے۔

پہلے پہل دونوں روح اور جسم کی طرح متحد تھے۔ مگر جب ایک روح صرف بدن یا مشینی بدن رہ گئی تو اس کے ساتھ جو ہو سکتا تھا۔ وہی ٹالسٹائی نے دکھایا ہے۔ لارنس نے اس کے متضاد صورت دکھائی ہے۔ ڈان رامن ایک ہندوستانی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے۔ لڑکی کا نام ٹریسا ہے۔ لڑکی نے اپنی روح تک، عاشق کے لئے مرکوز کر دی ہے۔ یہ بھی ایک طرف انتہا ہے۔ اگر پیری دوسری عورتوں کی جانب بڑھتا ہے اور نتاشہ اس پر حسد کرتی ہے، تو انجام کیا ہوتا ہے کہ ان کا رشتہ اور بھی کھنچاؤ اور تناؤ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے جھوٹ بولے گا اور کھچا کھچا رہے گا اور یوں زہر دونوں طرف گھلا رہے گا یہاں بچوں کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بچوں کو بھی خوشی باپ کے گھر میں مشترک حصہ لینے سے ملتی ہے۔ ایک ایسی بیوی کہ جو خود کو بے توجہگی کا شکار سمجھ رہی ہو، اس کے لئے تو بچے بھی بوجھ بن جاتے ہیں۔

ٹالسٹائی کا یہ جوڑا، بہت کم پایا جاتا ہے، مگر معاشرے میں ایسے عوامل اور ردِ عمل ہیں ضرور۔ ورنہ میاں بیوی ایک دوسرے کی ضد بن کر کم ہی زندہ رہتے ہیں۔ البتہ ایک عجیب بات ہوتی ہے اور وہ یہ کہ چند ماہ یا چند سال گزرنے کے بعد، میاں بیوی دونوں کے درمیان کہنے اور سننے کو آپس میں رہ کچھ بھی نہیں جاتا۔ دونوں، تنہا ہی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی تنہائی کو کھا بھی جاتے ہیں۔ وہ منجمد طریقے پر ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نہ حاصل کرتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ کبھی مسکرا دینا۔ یا کہنا کوئی بات تو کرو۔ اخبار پڑھتے رہنا یا بیزاری کی اباسیاں لینا، میاں بیوی کا مشغلہ رہ جاتا ہے۔ یہ ایک طرح درست بھی ہے کہ شادی آپس کی وابستگی کا ماحول پیدا کرتی ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ حسد نفرت اور اکتاہٹ کے جذبوں کو بھی فروغ دیتی ہے۔ اسی لئے صحیح اور معنی خیز وابستگی اور چمٹے رہنے میں بین فرق نظر آتا ہے کسی کو تسلیم کر لینے اور کسی سے عشق میں بنیادی فرق رہتا ہے۔

تسلیم کرتے ہوئے، پاسداری میں منافقت، میاں کا بیوی کی حد سے بڑھ کر عزت کرنا اور ساتھ ہی ان سوالوں کے پوچھنے سے گریز کرنا کہ آیا وہ اس کے ساتھ بستر میں خوش رہتی ہے۔ کیا وہ بھی اُس سے پیار کرتی ہے۔ کیا وہ اس کا حکم ماننے میں واقعی خوشی محسوس کرتی ہے کہ اس نے ایک خوش اخلاق باوفا، ایثار پیشہ، باہمت اور ایک ایسی خاتون سے شادی کی ہے کہ جو جانتی ہے کہ اُسے وہی کچھ سوچنا اور کرنا چاہیئے جسے اس کا شوہر پسند کرے۔ ایک میاں جو چھ ماہ بیمار رہا، اس نے اپنے دوستوں، رشتے داروں، نرسوں اور ڈاکٹروں، سب کا شکریہ ادا کیا۔ مگر بیوی سے کہا "تمہارا کیا شکریہ ادا کرنا کہ تم نے تو اپنی ذمہ داری پوری کی ہے" یہ فقرہ اس وقت کہا گیا جبکہ خاتون نے شوہر کے بستر سے لگ کر مسلسل چھ ماہ تک تیمار داری کی تھی۔ بیوی کی اچھائی تو گویا معاشرتی ضرورت ہوتی ہے کہ جو عورت کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے۔ عورت کی اپنی خواہشات، امنگیں، آرزوئیں، خواب اور جذباتی ضرورتیں کیا ہیں۔ ان کی نہ کبھی فکر کی گئی اور نہ کبھی یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ان کا کبھی اندازہ بھی کیا جائے۔ وہ عورت سے نرم دلی اور مہربانی سے بول سکتا ہے، اس امر کی پرواہ کئے بنا کہ وہ ایک فرد اور محسوسات رکھنے والی فرد بھی ہے۔ ایسے ہی افراد پٹاخ سے گر پڑتے ہیں۔ جب انہیں علم ہوتا ہے کہ ان کی بیوی انہیں پیار نہیں کرتی ہے۔

عورت سے مافوق الفطرت رویوں کی توقع کی جاتی ہے، جبکہ مرد کا دس عورتوں کے ساتھ سب کچھ کر آنا عین مردانگی متصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ عورت کو خواب تک صرف اُسی مرد کے دیکھنے چاہئیں کہ جس کے ساتھ اس کو وابستہ کیا گیا ہو یا وہ خود وابستہ ہو گئی ہو۔ ایک خاتون جو ایک شاعر کی بیوی بنی۔ وہ اس کی شاعری کی کم مداح تھی اور یہ شکایت زیادہ کرتی تھی کہ اس کے شوہر کو توغسلخانے کی زنجیر تک کھینچنی یاد نہیں رہتی ہے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ قارئین اُسے زیادہ جانتے ہیں اور بیوی کم، وجہ بیوی کی کم عقلی یا حسد نہیں۔ بلکہ یہ کہ اُسے زندگی سے خارج سمجھ کر شعر کہنے روا رکھے گئے تو اس نے اپنی زندگی سے اسی چیز کو منہا کر دیا کہ جسے

اس کی ذات سے زیادہ اولیت دی گئی۔ کچھ استثنائی معاملات میں عورت مرد کی شریک کار بنتی ہے۔ اُسے مشورہ دیتی اور اس کے فن پر بحث کرتی نظر آتی ہے۔ مگر بنیادی فرض محبت کرنے کا عورت پر عائد ہوتا دکھایا جاتا ہے۔ عورت کو ملکہ کہنے والے کے اندر سے عورت کے بارے میں انتہائی گھناؤنے جذبات رکھتے ہیں۔ عورت اگر مرد کی ذہنی سطح کے برابر آکر اس کا کام کر بھی دے تب بھی وہ سارے کام کو صرف اپنی ذہنی اپج اور کارنامہ گردانتے ہیں۔ جیسا کہ ٹالسٹائی کے سلسلے میں ہوا۔ اس نے اپنی بیوی کے مقابلے میں اپنی بیٹی کو سکرپٹ ٹھیک کرنے اور کاپی کرنے پر معمور کر کے مسرت حاصل کی۔

شادی شدہ زندگی مختلف سطحوں پر مختلف انداز اختیار کرتی ہے۔ مگر زیادہ تر عورتوں کا دن ایک جیسے عالم میں گزرتا ہے۔ شوہر صبح کو چلا جاتا ہے اور بیوی اس کے جانے کے بعد دروازہ بند دیکھ کر خود کو جبر سے آزاد محسوس کرتی ہے۔ بچے سکول چلے جاتے ہیں اور وہ گھر پر اکیلی ہوتی ہے۔ گھر کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے کام کرتی ہے۔ اس کے ہاتھ مصروف ہوتے ہیں۔ مگر دماغ خالی جو کچھ خاندان کے منصوبے اس کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ وہی اس کی غذا اور وہی اس کی زندگی ہوتے ہیں۔ ان کامیاں، اگر ذہین یا ہوشیار ہو تو بیوی یا بچوں کے لئے کوئی تحفہ، پھل، ٹافیاں یا مٹھائی لے کر آتا ہے، ویسے تو اکثر جان بوجھ کر تھکا ہوا چہرہ بنا کر، بیگ پھینکتے، جوتے اُتار کر دوسری طرف پھینکتے اور خود کو بستر پر گرا کر تھکا ماندہ ثابت کر کے، سارے خاندان کو اپنی بیش بہا خدمات کے اعتراف پر مجبور کرتے ہیں۔ جبکہ عورت جواباً خود اسی اعتراف کی متمنی ہوتی ہے۔ ہوتا کیا ہے کہ دونوں کی توقعات پوری نہ ہونے کے باعث کھنچاؤ کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ شام پھیکی گزرتی ہے۔ بیوی سوچتی ہے کہ اُدھر سے کچھ طلب ہوگی اور بور ہو کر دونوں سو جاتے ہیں، مگر پھر اگلی صبح اُسی نزاکتِ لب اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ وہ شوہر کو رخصت کرتی ہے۔ اگر سسرال بھی ساتھ ہے پھر تو روزانہ کام کرنے والی مشین کی طرح اس کی حیثیت ہوتی ہے۔ اگر تنہا ہے۔ شروع شروع میں تو خوابناک ماحول کو زندگی سمجھتی

ہے۔ مگر زندگی کی سختیوں کو دیکھ کر، کبھی کبھی پاگل پنے کی حد تک اکتاہٹ محسوس کرتی ہے۔

جو عورت، تمام نامساعدت کے باوجود، اپنی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ سوال بھی کرتی ہے اور گھڑے گھڑائے جواب سننے سے انکار کرتی ہے۔ وہ بھی برداشت کرنے اور گریز کرنے کے دوہرے عمل سے گزرتی ہے۔ اس کے اندر بھی ایک منفی رجحان پرورش پاتا ہے، وہ دوسروں کی مدد کرتی ہے، دوسروں کے کام آتی ہے۔ مگر اپنی تنہائی کے ہاتھوں کھوکھلا ہو کر، خود کو ختم کر لیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ شادی مرد کو کم تر کر دیتی ہے۔ مگر عورت کو تو بالکل تباہ کر دیتی ہے۔

شادی کے ابتدائی سالوں میں عورت خود کو خوابوں میں محصور رکھتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی بہت تعریف کرتی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کا میاں اس کے بغیر خود کو بہتر محسوس کرتا ہے، اور بچے بھی اس کی خدمات اور محسوسات سے غافل ہو چکے ہوں۔ تو اب گھر میں بھی اس کیلئے خلا آمیز آزادی فراواں ہوتی ہے۔ وہ بالکل تنہا ہوتی ہے اور اس کے پاس کرنے کو بھی کچھ نہیں ہوتا ہے۔ ایسے لمحوں میں جذباتی رشتے، رفاقتیں اور قربتیں کام آسکتی ہیں۔ مگر یہ سمجھوتے بھی تو کرنے سے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لکھنے والیاں اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ وہ اوّل تو وہ ایسے رشتے بنانے کے لئے تیس سال کی عمر تک وقت ہی نہیں نکالتی ہیں اور اگر نکال بھی لیں تو ایسے رشتے بنا نہیں پاتی ہیں۔ ورجینا وولف ڈورتھی پارکر، کیتھرین مینس فیلڈ۔ ان ساری خواتین لکھنے والیوں نے اس المیئے کو محسوس کیا ہے۔ فرانس میں ۳۰ سالہ عمر کی شادی شدہ عورتوں میں، غیر شادی شدہ کے مقابلے میں خودکشی کی شرح بہت کم ہے۔

شادی کا المیہ یہ نہیں کہ وہ عورت کو خوشیاں اور خوابناک خوشیاں دینے میں ناکام رہتی ہے۔ اعتبار۔ زندگی میں خوشی کی ایک بہت بڑی قدر ہے۔ یہی زندگی سے نابود ہوتا جاتا ہے۔ عورت کی زندگی کے ابتدائی بیس شادی شدہ سال بہت مطمئن اور پُرسکون ہوتے ہیں۔ اس وقت اُسے دنیا اور اپنی منزل، دونوں واضح اور اطمینان بخش معلوم ہوتے ہیں۔ مگر پھر احساس

ہوتا ہے کہ ایک ہی مرد کی خدمت، تواضع، دلداری اور بچوں کی آیا گیری کیا یہی زندگی کا آغاز اور معراج ہے؟ کبھی کبھی اس کی خدمات کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ اُسے مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ مرد کو بھی اس عمر میں آکر اس لطفِ مسلسل سے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔

آزادی کا بہرحال مطلب، کمزوری یا بے راہ روی نہیں ہوتا۔ جذبات اسی وقت بامعنی ہوتے ہیں۔ جب وہ حکم اور خوف سے مبرّا، زندگی میں عملی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ورنہ ہر قسم کی منافقت اور جھوٹ کو جنم بھی یہی جذبات دیتے ہیں۔ سب سے پہلا اثر تو یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو سمجھنے سے گریز کرتے ہیں۔ روزانہ ایک دوسرے کو دیکھنے سے نہ تو تعلقات میں فعالیت آتی ہے۔ نہ محبت پیدا ہوتی ہے۔ شوہر، بیوی کی جذباتی زندگی سے گریز کا طریقہ، اس کا بے پناہ ادب کر کے، اختیار کرتا ہے اور پھر اندر ہی اندر لاوا یک گران سوالوں کو ابالتا رہتا ہے۔ کیا وہ اس کے ساتھ ہم بستری کر کے خوش رہتی ہے، کیا وہ اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے کیا وہ واقعی اس کا کہنا مان کر خوش ہوتی ہے۔ کیونکہ اس نے ایک اچھی خاتون سے شادی کی ہے۔ وہ عادتوں میں بڑی پاکیزہ بااخلاق، متاثر کن، خوش مزاج اور شکل سے خوبصورت بھی ہے ایک شخص اگر چھ ماہ تک بیمار رہتا ہے تو وہ اپنے سارے دوستوں اور رشتے داروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، بیوی سے صرف یہ کہتا ہے۔ "تم نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔" یعنی عورت یا بیوی کے اچھے خصائص تو اخلاقی اور معاشرتی ضروریات ہوتی ہیں کہ جن کے بغیر عورت، عورت ہی قرار نہیں پا سکتی ہے۔ شوہر یہ باور ہی نہیں کر سکتا کہ یہ مشینی خاتون نہیں، بلکہ اپنے اندر دل، جذبات اور احساسات رکھتی ہے اور سارا دن کسی جذباتی گھٹن کے عالم میں گزارتی ہے۔ وہ بیوی سے جذباتی ہم آہنگی کئے بنا، اگر ملائمت سے بات کرتا بھی ہے تو یہ بھی ایک بیکار عمل ہوتا ہے۔

عورت کے ساتھ تاحیات پاکیزگی کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ مزید برآں، مکمل ماں اور ایمان دار خاتون کے اعزازات کی اس کی حوصلہ افزائی کے لئے استعمال کئے جاتے

ہیں، جو کچھ لارنس نے جنسی محبت کے بارے میں لکھا ہے۔ یعنی شادی، دو افراد کے باہمی اختلاط و اتصال کی داستان ہے۔ ابسن کی نورا، اس بات کو سمجھ گئی تھی کہ اس سے پہلے کہ وہ ماں یا بیوی بنے اُسے ایک فرد بن کر جینے کا سلیقہ آنا چاہیئے۔ شادی شدہ جوڑا، ایک سیل میں بند، ایک یونٹ نہیں ہے۔ بلکہ ہر فرد سوسائٹی میں علیحدہ وجود کے اعتبار کے ساتھ قبول کیا جانا چاہیئے۔ پھر اعتبار کے ساتھ ایک دوسرے پہ اعتماد کی منزل کو دعوت دی جا سکتی ہے۔

ایسا شادی شدہ جوڑا، مافوق الفطرت سوچ میں ہی جنم نہیں لیتا۔ بلکہ کئی جوڑے ایسے ہی مساوی رشتے کی بنیاد پر خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں، ان میں سے کچھ تو اپنے مضبوط جنسی تعلق کی بنا پر، باقی رشتوں کو قائم رکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی ایک دوسرے میں مدغم ہونے کا جذبہ نہیں رکھتے۔ کامریڈ شپ میں خوشی، اعتبار، اشتیاق، باہمی امداد، محبت ایک دوسرے کیلئے خوشی، لذت، قوت اور اعتبار کا باعث ہو سکتے ہیں۔ شادی کی ناکامی کی ذمہ داری آپ صرف ایک فرد پر نہیں ڈال سکتے ہیں۔ وہ مرد اور عورت کہ جو اپنی مرضی تو کجا، نام سے بھی واقف نہ ہوں، زندگی ایک دوسرے کی ناکام تشفی کی کوشش میں بسر کر دیتے ہیں۔ ہر چند روایتی شادی کا رواج کم ہو رہا ہے۔ اسی طرح روایتی نبھاؤ کا طریقہ بھی کمزور پڑتا جا رہا ہے اور اب طلاق گالی نہیں رہی ہے۔ اب شوہر بھی بیویوں کی متناسب آزادی کو تسلیم کرنے پر مائل نظر آتے ہیں۔ گھروں کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتے، گاڑی کبھی بیوی اور کبھی میاں چلاتے اور اسی طرح شاپنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ بیوی کی ملازمت کو بھی ضرورتوں کے ہاتھوں تنگ آکر قبول کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر ملازمت اور معاشی مساوات کے باوجود، شوہر کی نوکری کے مقام اور وسائل، بیوی کے مقابلے میں فوقیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ گویا معاشی مسابقت کے باوجود، معاشرتی طور پر عورت کا درجہ اور مقام، مسلسل پست رکھنے کی کوششیں بہرحال جاری رہتی ہیں اور اس کا علاج صرف اسی امر میں مضمر ہے کہ عورت کے لئے صرف شادی ہی کو، زندگی کے پیشے کے طور پر نہ پیش کیا جائے۔ عورت کو ذہنی اور معاشرتی طور

پر آزاد کیا جائے تو وہ بھی مرد کو آزاد کرے گی اور یوں ذہنی ہمواری کی راہ تشکیل پا سکتی ہے۔

عورت کام کرتی ہے تو ایسا کہ بس مرد کی آمدنی میں تھوڑی بہت امداد ہو سکے۔ اس کی پیشہ ورانہ کوئی حیثیت یا مقام نہ بن سکے، بلکہ اس کی کمائی کو تو گھر چلانے میں بامعنی مقام دینے کو بھی معاشرہ تیار نہیں، بلکہ جگہ جگہ سروے چھپتے ہیں کہ عورتیں اپنی کمائی، بیگ، جوتے نیل پالش اور تعیشات خریدنے پر صرف کرتی ہیں۔ یہ سارے سروے، عورت کی ملازمت کو غیر ضروری اور بلا جواز بنانے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں، بچے کی پیدائش کو بھی عورت کو ملازمت ترک کرنے اور بچے کی پرداخت پر توجہ دینے کے لئے لازمی قرار دیا جاتا ہے نوکری اور بچے کی پرورش کو بیک وقت ادا کرنے کے عمل کو ناممکن بھی متصور کیا جاتا ہے۔ ماں بننے کے بعد، عورت کا درجہ اور انداز بدل بھی جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ماں کے رشتے کی تاریخی اور سماجی حیثیت کا اگلے باب میں جائزہ لے لیا جائے۔

ماں

ماں بن کے ہی عورت اپنی جسمانی معراج کو پہنچتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت کا انگ انگ اس معراج کی تلاش میں پیاسا ہوتا ہے، آج سائنسی ترقی نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جنسی ملاپ کہ جو حمل کا بیج رکھتا ہے۔ اس کو قابو میں کر کے، حمل بھی ضابطے اور احتیاط کی ڈوری سے باندھا جا سکتا ہے۔ بلکہ مصنوعی حمل کاری نے تو جنسی ملاپ کی محدودیت کو اور بھی وسعت دے دی ہے۔

کچھ ممالک میں تو مانع حمل ادویات کو قانونی حیثیت حاصل ہے، جبکہ دیگر ممالک میں یہ عام طور پر غیر قانونی مگر ضروری ادویات کے طور پر دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ہیں۔ ویسے مثالیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ مرد اپنے جذباتی اور لطف کے لمحوں میں مانع حمل طریقِ استعمال کرنے کو گویا مانع لطف سمجھتے ہیں اور یہ ذمہ داری بھی عورت کے سر تھوپ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ مرتی کیا نہ کرتی۔ آخر کو حمل بھی تو اس کے اندر ہی ٹھہرے گا۔ نہیں چاہتی تو آخر خود ہی مانع حمل ادویات یا طریق اختیار کرے گی۔ ستم ظریفی تو یہ ہوتی ہے کہ ان احتیاطوں کے باوجود جب

عمل ہو جاتا ہے ۔ یہ خاص کر ان ممالک میں عام ہے جہاں مانع حمل ادویات ابھی اپنے ابتدائی استعمال میں ہیں۔ اب گھبرا کر، عورت اور مرد، دونوں اسقاطِ حمل کا رُخ کرتے ہیں۔ یہ بھی زیادہ تر ممالک میں غیر قانونی عمل ہے ۔

کچھ معاملات کہ جن میں رئیسانہ معاشرت متضاد رویوں کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس میں حمل کا مسئلہ بھی ہے ۔ اگر لڑکا کہیں یہ کام دکھا آئے تو کوئی بات نہیں۔ اگلے کی لڑکی خراب ہے۔ مگر یہی بات اگر اپنی لڑکی کو ہو جائے تو قیامت ۔

اسقاط کے بارے میں عمومی ناپسندیدگی کا رویّہ، اس بنیاد پر ہے کہ یہ خطرناک بلکہ عورت کی زندگی کے لئے ہلاکت خیز بھی ہو سکتا ہے ۔ ویسے ماہرین کے خیال میں اگر یہ باقاعدہ طبی احتیاط کے ساتھ کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا ہے ۔ مگر ترقی پذیر ممالک میں دائیوں کے ہاتھوں جس طرح لڑکیوں کا قتل عام ہوتا ہے ، وہ واقعی لائق تکذیب اور ہلاکیت خیز ہو سکتا ہے۔

زبردستی کا حمل، بچوں کی فوجِ ظفر موج لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ معاشرہ جو احتیاط اور مانع حمل ادویات کے اس قدر خلاف ہے ، وہ کوئی ایسا معاشرتی ڈھانچہ پیش نہیں کرتا کہ جس میں اتنے بے تحاشہ پیدا ہونے والے بچوں کے لئے زندہ رہنے اور زندگی کی بنیادی سہولتیں حاصل کرنے کا نظام ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر اعتراض کا کیا مطلب ؟ علاوہ ازیں، اگر غیر قانونی حمل ہو تو باپ بھی روپوش ہو جاتا ہے اور بے چاری اکیلی عورت ہی اس آفت کو پالنے یا کاٹنے کی سولی پہ لٹکی ہوتی ہے ۔

زیادہ بچے، ذہنی انتشار اور خلفشار کا سبب بھی بنتے ہیں۔ باپ نے مارتے مارتے بچے کی جان نکال دی یا عورت نے بچے کی ٹانگ توڑ دی یا بانہہ توڑ دی۔ یہ سارے عوامل ذہنی ناآسودگی اور بچے کو ذہنی طور پر قبول نہ کرنے کے باعث ہوتے ہیں۔

اسقاط بھی ہمارے معاشرتی درجوں میں مختلف درجات رکھتا ہے۔ غریب عورتوں میں کام کرنے کی ضرورت، اسقاط کو لازمی بنا دیتی ہے ۔ کچھ پڑھے لکھے جوڑے دو بچوں سے زائد اولاد

کو ناپسند کرتے ہیں اور خود ہی یا مانع حمل ادویات استعمال کرتے یا اسقاط کرا دیتے ہیں۔

شہروں میں عورتیں ایک دوسرے کی ایسے مشکل وقت میں مدد کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر یہاں اس پیسے کی فراہمی مسئلہ ہوتی ہے کہ جو وہ ڈاکٹر طلب کرتی ہیں کہ جو اسقاط کے لئے تیار ہوتی ہیں۔ پھر یہ خواتین ان دائیوں اور عطائیوں کی جانب رُخ کرتی ہیں کہ جو کم رقم لے کر کام کرنے کا وعدہ کر کے، عورت کی نسیں، بچہ دانی اور کبھی کبھی تو جان کو بھی خطرے میں ڈال دیتی ہیں اسی لئے عورتیں عام طور پر جب اکٹھی ہوتی ہیں تو آپس میں احتیاطی تدابیر کے بارے میں بات چیت کرتی ہیں اور اب تو مدد بھی ایسے کرتی ہیں۔ جیسے انگلی سے پھانس نکالتے ہوئے کیا کرتی ہیں۔

پہلے حمل اور پہلے بچے کا اسقاط، یہ دونوں باتیں عورت کے لئے بہت اہم ہوتی ہیں۔ وہ اگر حالات کی مجبوری سے اسقاط کراتی بھی ہے، یا حمل کسی اور قدرتی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ تب بھی وہ اُس تصور اور جرم کے خیال کو کبھی بھی ذہن سے جھٹک نہیں سکتی ہے۔ کبھی کبھی لڑکی اسقاط کے بعد، اُس مرد ہی سے ترکِ تعلق کر لیتی ہے اور کوئی لڑکی اس مرحلے کے صدمے کے باعث بہت یخ اور معکوس خیالات کی حامل ہو جاتی ہے۔

عورت کے مقابلے میں مرد، اسقاط کو ایک عمومی اور از بس یکے ضرورتِ ایام سمجھ کر، ٹالنے اور کر گزرنے کا عمل سمجھتے ہیں۔ جبکہ عورت کی اخلاقی، ذہنی، دینی اور جذباتی دنیا تہہ و بالا ہو رہی ہوتی ہے۔ اُسے بچپن سے سکھایا جاتا ہے کہ اس کی تخلیق، کائنات میں تخلیق کے سرچشمے کا حصہ ہے، وہ بچہ پیدا کرنے کے لئے اور آبادی میں اضافے کا فریضہ ادا کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ گھر میں بچہ پرورش کرنے والی عورت کے ہر عیب پر یہ کہہ کر پردہ ڈالا جاتا ہے کہ وہ بچے کی پرورش کی بڑی ذمہ داری کو پورا کر رہی ہے۔ اس لئے یہ چھوٹی سی ذمہ داری نہیں اُٹھائی جا سکتی۔ ایسی تمام ثقافتی اور اخلاقی پس منظر کے باوجود، جب مرد، عورت کو اسقاط کے لئے اس وجہ سے کہتا ہے کہ ابھی بچہ پیدا کرنے کا وقت نہیں، عمر نہیں۔ ضرورت نہیں یا پھر ابھی وہ عہدہ حاصل نہیں ہوا کہ جہاں بچے کا خرچ برداشت کیا جا سکے۔ تو کوئی ان خدا کے بندوں

سے پوچھے کہ یہ سارے سوال اس مسئلے کے درپیش آنے سے پہلے آپ کے ذہن میں کیوں نہیں آئے کہ عورت کے ذہنی صدمات کا اندازہ، اس کے جذباتی لمحات کے مقابلے میں کمتر لگانے کا اختیار آپ کو کس نے دیا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اسقاط کی اذیت اور خوف کے باعث ہی بہت سی لڑکیاں لزبین ہو جاتی ہیں اور بہت سی شادی کرنے سے ہی منحرف ہو جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ جب مرد، بطورِ مرد، اپنی مراد پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو وہ عورت کو تخلیقی مادے سے نجات پانے اور نکلوا دینے پہ آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مرد، عمومی طور پہ اسقاط کے خلاف بیان بازی کرتے ہیں۔ مگر دل ہی دل میں وہ اسے بہترین حل اور آسان طریقہ سمجھ کر قبول کرنے پر آمادہ بھی نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے اس تضاد کو ہنس کر قبول بھی کر لیتے ہیں۔ مگر یہی مرد کی قبولیت عورت کے دل میں گہرا زخم پیدا کر دیتی ہے۔

عورت کا بے عصمت ہونا، مرد کے لئے بڑا قابلِ شرم موضوع ہوتا ہے۔ عورت کو بے عصمت کرنے والے، خود کو پارسا ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں اور اس خون کے لوتھڑے سے لاتعلق ہو جاتے ہیں کہ جو اُن کے مادے سے وجود حاصل کرتا ہے اور یہیں سے عورت، مرد کے تعلق کی سطحیت یا بنیاد واضح ہونے لگتی ہے۔

بچپنے سے بلوغت تک، عورت کے اندر، زچگی کے بارے میں بہت سے خیالات پیدا ہوتے اور ختم ہوتے ہیں۔ بچے کے لئے یہ معجزہ بھی تھے اور کھیل بھی، گڑیا، آئندہ کے بچے کی علامت بن کر اس کے ہاتھوں میں جھولتی ہے۔ کچھ لڑکیاں ناسمجھی ہی میں چھوٹے بہن بھائیوں پر ایسے حکم چلاتی ہیں۔ جیسے وہ اُن کی ماں ہوں، اور کچھ عورتیں، زچگی کے خوف میں مبتلا ہو کر نرسیں، دائیاں، آیا، گورنس یا پھوپھیاں بن کر زندگی گزارنا بہتر سمجھتی ہیں، کچھ اور عورتیں یا تو عشق یا اپنے پیشے میں اس قدر منہمک ہوتی ہیں کہ بچے کی پیدائش کو اپنے اور اپنے شوہر دونوں کے لئے بوجھ متصور کرتی ہیں۔

اکثر خواتین یا تو جنس سے گریز کر کے یا پھر احتیاطی تدابیر اختیار کر کے، جنسی روابط استوار

کرتی ہیں، ویسے ذہنی توازن اور اپنے آپ پر قابو رکھنے کی صلاحیت بھی، زچگی نہ ہونے دینے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ کبھی تو اعصابی تناؤ، زچگی نہیں ہوتے دیتا اور اس کو دور کرنے کے لئے باقاعدہ طبّی امداد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ زچگی کے دوران، عورت میں بچپنے سے بلوغت تک کے تمام مراحلِ جنس اور اپنے سامنے پیش آنے والے واقعات کو ذہن میں لاکر اپنا جائزہ لیتی ہے۔

ماں بنتے ہوئے، عورت دراصل اپنی ماں کا ہی روپ لے رہی ہوتی ہے۔ اگر وہ بچے کی خواہشمند ہے تو پھر وہ زچگی سے بھی محظوظ ہوگی اور اپنے اندر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ کر خود ہی خوشی محسوس کرے گی۔ لیکن اگر وہ ابھی تک ماں کے زیرِ اثر ہے تو پھر ہر معاملے میں ماں کی رائے، نگرانی اور ہدایت کو ترجیح دے گی۔ اُسے محسوس ہوگا کہ وہ تو ماں کے بنا کچھ بھی نہیں کر سکتی ہے۔ بچے سے زیادہ ماں کی ہدایت کو ترجیح دینے والی ماؤں کو اسقاط بھی ہوتے دیکھا ہے۔ ماں سے نفرت کا جذبہ بھی، زچگی کے دوران، نقصان دہ اثرات چھوڑتا ہے۔

ماں، باپ کا آپس کا رشتہ ہی دراصل بچّے کی اوّلین تربیت گاہ بنتا ہے۔ ایک باشعور اور سنجیدہ خاتون، ماں بننے کے بعد، بچّے کو بالکل اپنے انداز میں پالنا چاہتی ہے۔ مجھے ایک خاتون کا علم ہے کہ وہ جب کسی جوان اور سنجیدہ آدمی کو دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آجاتی تھی۔ اسی خیال سے نہیں کہ اس مرد کے ساتھ جنس خوب ہو سکتی ہے، بلکہ اس خیال سے کہ یہ زندگی کا بہترین ساتھی ہو سکتا ہے۔ ایسی ہی خواہشمند خواتین تو مصنوعی حمل کاری کے ذریعہ بھی خوبصورت بچہ پیدا کرنے سے گریز نہیں کرتی ہیں۔ ہر ایک صورتِ حال میں، ماں کا بچے کی جانب توجہ دینے کا عمل، اسی ردِّ عمل پر منحصر ہوتا ہے کہ باپ، ماں کی جانب کس قدر توجہ کرتا ہے۔ اگر ماں بزدل، ناتجربہ کار اور بچگانہ ذہن کی ہو تو باپ کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے، کئی لڑکیاں بے حال اور پریشان ہو جاتی ہیں کہ نوعمری ہی میں کئی بچے ہو جاتے ہیں اور وہ میاں سے زیادہ توجہ طلب کرنے لگتی ہیں۔ وہ اپنی پریشانی بانٹنے کے لئے چاہتی ہیں کہ

میاں زیادہ سے زیادہ وقت گھر پر گزارے اور اس کی مدد کرے۔ اس سلسلے میں اگر اُسے گذشتہ واقعات کو بڑھا چڑھا کر اور خود کو مظلوم ثابت کر کے کہنے بھی پڑیں تو وہ گریز نہیں کرتی ہے۔ لیکن اگر عورت اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے تو وہ صورتِ حال کو سمجھ کر اس سے سمجھوتہ کرتی ہے اور زچگی کو عذاب یا افتخار بنانے کی بجائے، اس کو روزمرہ کی تبدیلیوں کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے، اپنے آپ کو آنے والے زمانے کے لئے تیار کرتی ہے

کبھی کبھی خاندان میں بچے کی ضرورت، میاں بیوی اور گھر کے شرکاء کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بھی ہوتی ہے، مزید برآں خاتون کو مزید ذمہ دار، خود آگاہ اور گھر میں اپنی منزل کی جانب گامزن کرنے کے لئے خشتِ اول کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر عورت اپنے میاں سے متنفر ہے تو پھر وہ بچے پر پورا قابو رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بچے کو بھی اپنی نفرت اور اذیت ہی کی توسیع سمجھتے ہوئے۔ بچے سے بھی لاشعوری طور پر نفرت کرنے لگی ہو۔

ان تمام صورتوں کے باوجود زچگی ایک عجیب و غریب ڈرامہ ہے۔ جو صرف اور صرف عورت کے اندر رونما ہوتا ہے، وہ خود میں بھری بھری اور زخمی دونوں طرح ہی محسوس کرتی ہے، وہ کچھ اپنے وجود میں محسوس کرتی ہے اور کچھ اپنے وجود سے الگ ہوتا ہوا بھی۔ وہ خود کو دنیا کی طرح وسیع سمجھتی ہے۔ مگر یہ تجربہ کبھی کبھی اُسے محسوس کراتا ہے کہ وہ تو صرف بچہ پیدا کرنے کے لئے ایک مشین ہے خود اس کا اپنا وجود کچھ نہیں ہے۔ ایک نئی زندگی، ایک نیا وجود اپنا آپ منوانے کے لئے دنیا میں آرہے ہیں۔ وہ تو ہوا میں اُچھلتی گیند کی طرح، باپ کے میزان سے نکل کر، اولاد کے پلڑے میں پڑ جاتی ہے۔ عورت بڑھتے پیٹ اور پیٹ میں اُچھلتے بچے کی کیفیت کو حیرت اور خوشی کے ساتھ لئے، بھرپور زندگی کا مظہر بنے گھومتی ہے۔

کچھ عورتیں زچگی کا شوق رکھتی ہیں اور وہ بار بار اس دور اور عمل سے گزرنا چاہتی ہیں۔ جیسے ہی بچے کا دودھ کا زمانہ ختم ہوا نہیں اور وہ دوسرے بچے کی خواہش میں تڑپنے لگیں۔ ایسی عورتیں

مائیں کم اور بچے جننے کی مشینیں زیادہ معلوم دیتی ہیں۔ مرد کے ساتھ تحفظ کا عالم بھی کچھ عورتوں کو زچگی کے دوران ہی ملتا ہے۔ مشرقی ممالک میں زیادہ زچگی اسی سبب سے دیکھنے میں آتی ہے کہ عورت اپنی ذاتی کوشش سے مرد کو گھیر گھار کر حمل ٹھہرنے کے جذباتی عمل کی جانب لاتی ہے کہ اس دوران اور بچے کے دودھ پلانے کے دنوں کے دوران قانونی طور پر مرد طلاق نہیں دے سکتا ہے۔

کمال کی بات یہ ہے کہ عورت کے جسم کی ہیئت و غایت کے علاوہ اس کی جانب دیکھنے کا نظریہ بھی بدل جاتا ہے۔ وہی چھاتیاں کہ جو نسوانیت کا گہرا روپ اور نظارہ بنتی تھیں۔ ان کے بارے میں نظریہ ہی بدل جاتا ہے۔ دودھ پلاتی مائیں۔ اکثر سب کے سامنے بس ذرا سا کپڑا آگے کر کے بلکہ افریقی ممالک میں تو راہ چلتے گریبان کھول کر دودھ پلاتی نظر آتی ہیں اور اسی عالم میں عورت کو کبھی کبھی یہ یقین بھی آتا ہے کہ اُسے ایک انسان کی طرح دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر یہ محض ایک سراب ہے کہ بچہ وہ نہیں بناتی بلکہ بچہ تو اس کے اندر مادۂ تولید سے خود بخود اپنا آپ بناتا، اپنے لئے خون، پانی اور ہوا کھینچتا ہے۔ گویا ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ انسان کا بنایا ہوا ایک طرح کا خدا ہوتا ہے۔ وہ جب تک دنیا میں آ نہیں جاتا۔ وہ آزادی اور شعور کی حدود میں داخل نہیں ہوتا ہے۔ عورت اس رازِ دروں کی پاسدار ہوتی ہے۔ وہ غیر یقینی کی کیفیت کہ بچہ، لڑکا ہے کہ لڑکی، بچہ ٹھیک ٹھاک ہے کہ خدانخواستہ، ذہنی طور پر یا جسمانی طور پر ناقص ہے۔ ساتھ ہی ساتھ، بچے کی پیدائش کے دوران اس کی جان کو جو خطرہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہیگل نے کہا ہے "بچے کی پیدائش والدین کے لئے موت کے برابر ہوتی ہے"، مگر یہ زیادہ تر ماں پر لاگو ہوتا ہے، یہ خوف، بچے کی پیدائش کے دن نزدیک آتے آتے اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

مگر موت و زندگی کی اس کشمکش کے باوجود، عورت میں اس کو برداشت کرنے کا حوصلہ خود تربیتی سے بڑھتا جاتا ہے اور خود تربیتی کی یہ منزل، بچے کی پیدائش کے لئے خوبصورت تیاریوں کپڑے بنانے، کمرہ بنانے اور بچے کی پرورش کے منصوبوں کے حوالے سے طے کر لی جاتی ہے۔

کچھ پادری اور مذہبی لوگ کہتے ہیں کہ عورت جس لمحے مادۂ تولید جذب کرتی ہے۔ اس وقت کے لطف و انداز سے سمجھ سکتی ہے کہ آج ماں بننے کی بنیاد رکھی گئی۔ مگر یہ غلط ہے۔ عورت کو

تو ماہواری بند ہونے، اُلٹیاں آنے، بے ہوشی کے دورے پڑنے پہ ڈاکٹر لوگ بتاتے ہیں کہ یہ عورت حاملہ ہے۔ اب عورت کا جسم بھرنا، چھاتیاں سخت اور بھاری ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ کچھ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ متلی ہونے کا مطلب ہے کہ عورت پریشان ہے اور ایک طرح بچے کے وجود میں آنے کے مضمرات کو یا تو قبول کرنے کو تیار نہیں یا تسلیم نہیں کرتی ہے۔ اسی طرح نامعلوم وجوہات کی بنا پر حاملہ عورتوں میں ہاضمے کی خرابیاں بھی پائی گئی ہیں۔ اسی طرح قبض، دستوں کا آنا یا پٹھوں کا اینٹھنا، اعصابی تناؤ اور حمل کے دوران ردوبدل کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے عوامل کو ظاہر کرتے ہیں اور جب یہ بڑھ جاتے ہیں تو اسقاط بھی ہو جاتا ہے۔ عورت جتنی خود پسند ہو، ایسے عوامل اتنے ہی اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ کچھ عورتیں حمل کے دوران خاص قسم کی چیزیں املی، آلو بخارا، کھٹا کھانا وغیرہ پسند کرتی ہیں۔ کچھ کو پراٹھوں، گھی میں تلی چیزوں وغیرہ سے بُو آتی اور متلی محسوس ہوتی ہے۔ توجہ طلب کرنے کی لاشعوری خواہش بھی، ان بیماریوں اور علامات کا باعث ہو سکتی ہے۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ روایت کے علاوہ نانی دادیوں اور سہیلیوں سے سنا ہوتا ہے کہ حمل ٹھہرتے ہی اس قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ بس یہی لاشعوری تربیت اُسے حمل ٹھہرتے ہی ان توقعات کی جانب ملتفت کر دیتی ہے کہ اب یہ ہو گا۔ اب یوں ہو گا اور اب یوں ہو گا۔ تو وہ کبھی کبھی تو خود کو باور کراتی ہے کہ مجھے اب یہ ہونا چاہیئے اور یہ ہو رہا ہے۔ ویسے تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حاملہ کی جانب زیادہ توجہ دینے سے بھی، ایسے ہی امراض کا عود کرنا، خالی از ذکر نہ ہو گا۔

بچہ کیا اور کیسا ہو گا؟ یہ ایک اہم سوال، عورت کو پریشان اور بے چین رکھتا ہے۔ وہ ایک دوسری سے سوال کرتی۔ کبھی پڑھتی اور کبھی بچوں کی تصاویر دیکھتی ہیں۔ ایک عورت کو کسی نے کہہ دیا کہ وہ اناناس کھائے تو بچہ خوبصورت اور صحت مند ہو گا۔ مشکل یہ ہوئی کہ وہ زمانہ اناناس کے دستیاب ہونے کا نہیں تھا۔ بس عورت نے اسے مسئلہ بنا لیا اور آخر بڑی مشکلات کے ساتھ، اناناس حاصل کیا گیا اور یوں مسئلہ حل ہوا۔

وہ عورتیں کہ جو اپنے آپ کو اور اپنے جسم کو مرد کی توجہ کا مرکز اور ہر لمحہ ان کی نظر کے حصار میں رہنا چاہتی ہیں، ان کو حمل اور اس کے بعد پیدا ہونے والے اثرات فکرمند کرتے ہیں کہ اب وہ مرد کی اس توجہ کو نہ حاصل کر سکیں گی۔ جو ان کے جسم کے خطوط حاصل کرتے تھے۔

بچے کا ماں کے پیٹ میں ہلنا، عورت کو ہلا دینے والا عمل ہوتا ہے۔ اب وہ ماں سے آزاد بھی ہے، آزاد ہونے کی کوشش بھی کر رہا ہے اور ماں کے پیٹ میں بھی ہے۔ جیسے جیسے بچے کی پیدائش کا زمانہ قریب آتا جاتا ہے۔ پریشانی اور تکلیف بڑھتی جاتی ہے، کچھ عورتیں تو بچے کی پیدائش کو سزائے موت کے برابر سمجھتی ہیں اور ایسے ہی اعصابی تناؤ کی شکار عورتیں، بچے کی پیدائش کے دوران مر بھی جاتی ہیں۔

بچے کی پیدائش نئی ذمہ داریوں کا سلسلہ ہوتا ہے۔ ایک تو پیدائش سے پہلے اور بعد میں اُسے یہ افتخار اور غصہ دونوں ہوتے ہیں کہ وہ اکیلی ساری تکلیف سہہ رہی ہے اور ذمہ داری اُٹھا رہی ہے۔ آزاد اور خود مختار عورتوں کی اور ہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ بچے کی پیدائش کے لمحے تک، بالکل یقین کے ساتھ گھومتی پھرتی کام کرتی اور ہنستی بولتی نظر آتی ہیں۔ یہ نہیں کہ بالکل خوف سے آزاد ہوتی ہیں۔ ہاں پڑھنے، دوسری تجربہ کار عورتوں اور گائنا لوجسٹ سے باتیں کرنے اور خود میں اعتماد رکھنے کے باعث، بچے کی پیدائش کو نہ وہ مسئلہ بناتی ہیں اور نہ بچہ پیدا ہونے کے بعد، معمولات کو یوں بکھیرتی ہیں کہ لگے گھر میں طوفان آیا ہوا ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد کچھ عورتیں اپنے آپ کو اندر سے خالی محسوس کرتی ہیں مگر زیادہ تر عورتیں اپنے اندر تشکیل پانے والی مخلوق کو دیکھنے کی بہت خواہشمند ہوتی ہیں۔ کچھ عورتیں بچے کے وجود کو اپنے ہاتھ اور پیر کی طرح، اپنے وجود کے ساتھ لگا محسوس کرنے کی خواہشمند بھی ہوتی ہیں۔ یہ بھی توقع رکھتی ہیں کہ بچہ ان کے نو ماہ کے وصال کو چند لمحوں میں شناخت کر لے گا اور کسی اور کی جانب متوجہ ہوگا ہی نہیں۔

زچگی کا زمانہ، کئی معانی میں حمل سے بھی مشکل زمانہ ہوتا ہے۔ بچے کو دودھ پلانا کہ

چھوٹا بچہ ہر دو منٹ بعد سو جاتا ہے۔ اس کا سر نہیں ٹھہرتا۔ اس کو سنبھال کر اٹھانا، منٹ منٹ پر نیپکن بدلانا اور پھر اپنے آپ کو دوبارہ صحت مند حالت میں بدلنا۔ کچھ مائیں سرے سے دودھ پلانے کے عمل کو بیکار اور ناقابلِ عمل ذمہ داری سمجھتی ہیں۔ وہ بچے کو بخوشی تھپکتی، دودھ پلاتی، نیکن بدلاتی ہیں۔ مگر جیسے ہی ہسپتال سے گھر آتی ہیں۔ انہیں یکایک یہ خیال جھنجھوڑتا ہے کہ کہیں ان کی چھاتیاں نہ ڈھلک جائیں۔ اب بچے کا نپل منہ میں لینا ان کے لئے تکلیف دہ عمل ہو جاتا ہے۔ اب اُسے لگتا ہے کہ بچہ تو اس کی ساری جان کھینچے لئے جا رہا ہے، اب وہ اس بچے کی جانب، خشمگیں نظروں سے دیکھتی ہے اور اپنا دودھ پلانے سے گریز کرتی ہے کہ یہ دودھ پلانا اس کو آزادی کا طوق معلوم ہوتا ہے۔

زچگی کے دوران، لڑکی کا اپنی ماں کے ساتھ تعلق بھی کافی اہمیت کی بات ہے۔ اکثر لڑکیاں زچگی میں اپنی ماؤں سے مدد اور تعاون کی طلب گار ہوتی ہیں۔ اسی طرح اپنے شوہر سے تعلقات بھی بچے سے تعلق اور اس کی جانب توجہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ معاشرتی اور معاشی ماحول، بچے کو گھر میں ایک ضرورت، خوشی اور توجہ کا منبع یا ناخوشی، عدم توجہی اور گھر کا شیرازہ بکھیرنے کا مرکز بناتا ہے۔

پالنے میں بچے کا مسکرانا، فطری عمل نہیں، بلکہ اس کے سامنے ماں باپ اور تمام لوگوں کا مسکرانا، اُسے مسکراہٹ سکھاتا ہے۔ ماں ہی بچے کو پیار اور نفرت، غصہ یا مہربانی کا انداز سکھاتی ہے۔ وہ عورتیں کہ جو بہت رخ مزاج، چڑچڑی اور ناآسودہ ہوتی ہیں، وہ بچے کو چیخ چیخ کر بچے کو چڑا دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ یہ بچہ بھی انہیں پیار نہیں کرتا ہے۔ نو ماہ تذبذب اور اندیشوں کے مہینے ہوتے ہیں۔ تو دسواں مہینہ مزید خوف اندیشے اور ذمہ داریوں کو لئے وارد ہوتا ہے۔ کچھ مائیں بچوں کو اس لئے پیار کرتی ہیں کہ انہیں ان کے باپ یعنی اپنے شوہر سے پیار ہوتا ہے۔ مگر یہ کہنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ پیار تو بچے ہی کو کرتی ہیں۔ مگر اسی بہانے شوہر کی بھی تشفی کرتی ہیں۔ ایسے شوہر کہ جن کی بانہوں میں، عورت ناآسودہ اور

غیر مطمئن رہتی ہے۔ وہ ان کے بچے پیدا کرنے کے بعد بھی، اپنے آپ کو تنہا اور خالی محسوس کرتی ہے۔

کچھ مائیں، ایک بچہ پیدا کرتے ہی، اس کی پرورش سے بے نیاز، دوسرے حمل کیلئے تیار ہوتی ہیں۔ کچھ ماہرینِ نفسیات یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ مائیں بچے کو ہی عضوِ تناسل کا بدل سمجھتی ہیں۔ مگر یہ قیاس بہت حد تک حقائق و شواہد پر مبنی نہیں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس طرح مرد، عورت پر محبت، ہم آغوشیت اور جنسی عمل کے ذریعہ ایک طرح کا غلبہ حاصل کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح عورت، دودھ پیتے بچے کو ہاتھوں میں لے کر، خود سے چمٹا کر، لذت حاصل کرنے کی سعی کرتی ہے وہ بچے کو اپنے سینے پہ لٹاتی اپنے پیٹ پہ اُچھالتی اپنی ٹانگیں اٹھا کر اس پر بٹھاتی۔ اپنے ساتھ بغل میں لٹا کر اُسے گرم کرتی ہے۔ کچھ عورتیں بچے کو دودھ پلاتے ہوئے، جنسی حرارت بھی محسوس کرتی ہیں اور وہ اس وقت اپنے اسی فردی جذبے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔

مادریت اس وقت کچھ اور شکل اختیار کرتی ہے۔ جب بچہ بڑا ہو کر فرد بننے کی جانب گامزن ہوتا ہے۔ بہت حاکمانہ طبیعت یا جذباتی کیفیت رکھنے والی مائیں، بچوں کی جانب کم جذباتی اور کم توجہی کرنے لگتی ہیں۔ جبکہ ماں کو بچے کو سمت دینے والی، نچھاور ہونے والی اور اُبلتے چشمے کو سرفرازی دریا عطا کرنے والی کیفیات کا اظہار بننا چاہیے۔ ماں کو دقت اس وقت ہوتی ہے کہ جب اُسے نہ اولاد کی جانب سے اور نہ خاوند کی سمت سے اس خدمت یا محبت کا اعتراف ملتا ہے۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ عورت کہ جسے بچے کو پرورش کرنا ہوتا ہے۔ وہ عورت خاوند کے علاوہ دیگر عوامل کے باعث سخت غیر مطمئن اور بیزار کن زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے۔ جنسی طور پر وہ ناآسودہ ہوتی ہے۔ سماجی طور پر مرد سے کم تر قرار دی جاتی ہے۔ دنیا یا مستقبل پر اس کا کوئی اختیار یا کوئی حق نہیں ہوتا ہے۔ ان تمام ناآسودگیوں کا جواب وہ اپنے بچے سے چاہتی ہے کہ اُسے سینے سے لگا کر بھینچتی ہے، پاس سلاتی ہے۔ کھلاتی ہے اور مستقبل میں اپنے تمام نقصانات کے ازالے کا منبع بھی اُسی کو سمجھتی ہے۔ لڑکی کو اپنی گڑیا کو ڈانٹتے

کان مروڑتے اور اس کا بیاہ رچاتے دیکھئے اور اسی فلسفے کا تجزیہ کیجئے۔ ایک ماں جو اپنے بچے کو سزا دیتی ہے، وہ صرف بچے کو سزا نہیں دے رہی ہوتی ہے، بلکہ وہ مرد سے اپنی محرومیوں کا انتقام لے رہی ہوتی ہے۔ ایسے رویوں کو عموماً پہلے زمانے میں صرف سوتیلی ماؤں تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ حاکمیت کی عادت رکھنے والی مائیں، بچوں کو مٹی کے کھلونوں کی طرح اٹھاتی اور پٹختی ہیں کہ جیسے وہ بھی ان کے ملازم ہوں۔ ایسی مائیں بچوں سے ضرورت سے زیادہ تشکر اور احساس کی توقع رکھتی ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ "یہ میرے بچے ہیں" اُن کے اِسی احساسِ افتخار کا مظہر ہوتے ہیں۔ جس میں ان کی ذات زیادہ واضح اور نمایاں ہوتی ہے۔ اسی لئے جب بچہ ان کے معیارات پورے نہیں کر رہا ہوتا تو گویا ان کے احساسِ فرض سے لے کر منصب تک کو ٹھیس پہنچتی ہے اور پھر ان کا غیض و غضب ظاہر ہوتا ہے۔ یہی غیض و غضب آگے جا کر بچے کے باغی اور ماں کے مزید سخت رویے میں منعکس ہوتا ہے۔ اس کے بالکل متضاد رویہ بچے کے آگے ہر وقت ہاتھ باندھے، منت کرتے اس کا مزاج درست کرتے، ہاتھ جوڑے سرِ تسلیم خم کئے رکھنا ہے اور اپنے اندر کے خلا کو بھرنے کی ناکام کوشش کرنا ہے، ایسی مائیں، بچوں کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں، وہ اپنی ساری ذاتی پسند و ناپسند، مصروفیت، خواہش اور خوشی ترک کر کے ہر چیز بچے کے لئے موقوف کر دیتی ہیں۔ پھر خود ہی مظلوم بھی بن جاتی ہیں اور ان تمام باتوں کے ترک کرنے کے عوض بچے سے اس کی آزادی اور اپنی پسند کی مصروفیت کی خیرات بھی چاہتی ہیں۔ روتی ہیں، چلاتی ہیں، اپنی مظلومیت اور خدمات کا برملا اعلان کرتی ہیں اور یوں بچے میں تمام عمر کے لئے احساسِ جرم پیدا کر دیتی ہیں۔ ماں کا موقف یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے اسے بڑا کرنے کے لئے کیا ہے۔ اس کا عوضانہ بچے پہ لازم آتا ہے اُدھر باپ بچے کی ہر غلطی کا مجرم ماں کو ٹھہرا کر عجب تناؤ کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مائیں کہ جو کام کرتی ہیں۔ وہ تو نوکری کیلئے باہر گزارے وقت کو غنیمت سمجھتی ہیں۔ ورنہ ہر وقت ایک ہی عذاب سر پہ سوار ہے۔

بچہ نہ جانور کی طرح زبان سکھانے سے پلتا ہے نہ آداب کی ورزشیں کرانے سے تمیز

کی مشین میں ڈھلتا ہے۔ اس لئے بچے کے ساتھ بچہ، بدتمیز، توتلا، بے وقوف، چالاک یعنی ہر انداز کہ جس پر بچہ چل کر سیکھنے اور ماں سے قربت محسوس کرسکنے کی صلاحیت بیدار کرسکے۔ تو یہی ماں کی خوبی اور بچے میں بولنے، زندگی سے قریب تر محسوس کرنے کے ساتھ ان کو اظہار کا روپ دینے کی عادت ڈالنے کی تربیت ہوگی۔

پس جو ماں ان عوامل سے آگاہ ہے۔ وہ تو تربیت کے دوران پیچیدگی اور جذباتی تناؤ محسوس نہیں کرتی ہے۔ بچے کو پارک میں ٹہلانے لے جانا۔ اس کے ساتھ کھیلنے کے معاملات تو درست، مگر جب ماں کھانے پکانے، کپڑے دھونے، مہمانوں کی تواضع اور خاص کر شوہر سے "ملاقات" کی منزل پہ ہو، اس وقت بچہ ماں کو بہت تنگ کرتا ہے اور ماں بچے سے بہت عاجز آتی ہے۔ اس وقت بچہ اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے رکھی چیزیں توڑتا پھوڑتا ہے۔ کبھی رونے لگتا ہے۔ گویا اس طرح وہ زندگی، ماں باپ کے بغیر گزار رہا ہوتا ہے اور اس تنہائی سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ کبھی ماں باپ بہت مصروف ہوں تو اولاد اور والدین کے درمیان یہ احساسِ تنہائی اور بھی شدید ہوجاتا ہے اور اس پر مستزاد، والدین بچوں کو ان کی پرورش کرنے کا احسان جتا کر جھٹلانے اور ان کی اطاعت کروانے کا جو شوق رکھتے ہیں، یہ جلتی پر تیل کا کام کرتا ہے۔ بچہ بغاوت کرتا ہے۔ ماں اس کو اپنی مصروفیت کا جواز پیش کرتی ہے، مگر وہ بچے کے خوف، دلچسپیوں، ضروریاتِ ذہنی وجذباتی اور اس کے اندر پلتی نفرت کو سمجھے بغیر، وقت بے وقت اس کو آداب سکھانے کے بہانے ڈانٹتے ہوئے، بچے کو اور بھی ناآسودہ، باغی اور بدتمیز بنا دیتی ہے۔

جب بچہ بڑا ہوتا ہے تو متضاد صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ اب بچے کی دلچسپیاں اور ماں کی خواہشات میل نہیں کھاتی ہیں۔ بلکہ جو بچے اپنی مردانگی پہ اترانے کا طریقہ اپنے باپ سے سیکھ کر جوان ہوتے ہیں۔ وہ ماں کی اضطراری کیفیت یعنی بچے کے گھر دیر سے آنے، بچے کے دوستوں میں بے پناہ مصروف رہنے کے عمل کو، پریشانی میں متبدل ہوتے دیکھ کر، ہنستے

اور اکثر مذاق بھی اُڑاتے ہیں۔ خاوند بھی نہ بچے کی کیفیت کو سمجھتا ہے اور نہ ماں کی۔ اُسکی گھر میں جس اجنبیت سے پرورش کی گئی ہے۔ وہ اجنبیت تو اِسی ماحول کو جنم دے گی۔ جس میں نفرت بغاوت اور حکم نہ ماننے والی کیفیت کارفرما ہو۔

البتہ ان کیفیات میں فرق بچے کی جنس کے مطابق ہو سکتا ہے۔ یعنی جب یہی حرکت لڑکا کرتا ہے تو لڑکے کے معاشرتی منصب کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لڑکے کی ماں ہونا، گویا تمام تر خدشات ختم کر کے، ایک قابلِ اعتبار فرد کو جنم دینے کے مترادف ہے کہ جو بڑا ہو کر سپاہی سے لے کر سیاسی رہنما تک بن سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ ماں کے حکم پہ چلے۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق، جو عورت، ایک دفعہ مردانگی کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ وہ ہر منزل پہ اُسے نیچا دکھانے کی کوشش میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ ایسی عورتیں کئی دفعہ دیوانگی کی حد پہ پہنچ کر بچے کو اس کا عضوِ تناسل کاٹ دینے کی دھمکی دے کر، آداب سکھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جوان سے کم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے منصب کا رعب خود اپنے بچوں پر ہی ڈال کر بچوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرتی ہیں۔ وہ میاں کو بچے کی طرح اور بچے کو دودھ پیتے طفل کی طرح کا رویہ دیتی ہیں۔ وہ اس کو خواب تو پاتال چھونے کے دکھائیں گی مگر اس کے ذہن اور بدن کو اپنی مٹھی میں بند رکھنا چاہیں گی۔ وہ اس کے اعتمادِ ذات کو صرف اپنے ادب کے لئے استعمال کروانا چاہیں گی اور اگر وہ بچہ اس کے خوابِ افتخار کے مطابق بڑا ہیرو، چیمپئن یا دانشور نہ بنے، تو ماں کے لئے یہ بات بڑی احساسِ کمتری کی بات ہو گی۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ لڑکے اپنے گھر کے اس قسم کے ماحول کو پسند کر کے، اس میں ڈھل بھی جاتے ہیں کہ جو کچھ باپ کہے وہ بہتر اور صائب ہے۔ ماں کہ جو تصورات کے ہیولے بنتی رہی تھی، پھر اکیلی رہ جاتی ہے۔ پھر وہ لڑکی کی تربیت کی جانب متوجہ ہوتی ہے۔

اب وہ بھرپور توجہ لڑکی کی انفرادیت کے فروغ کے لئے صرف کرتی ہے۔ ماں اور بیٹی کے تعلقات بہت ڈرامائی ہوتے ہیں۔ بیٹی میں ماں اپنی ہی شبیہہ تلاش کرنے اور تیار کرنے کی

کوشش کرتی ہے اور جب لڑکی بھرپور شبیہہ بن جاتی ہے تو انفرادیت پسند ماں کے لئے یہ بھی ایک المیہ ہوتا ہے۔ کچھ مائیں تو لڑکی کی اس طرح کی پرورش سے آسودہ ہو جاتی ہیں۔ مگر کچھ مائیں اپنی زندگی کی محرومیوں کا ازالہ بھی اپنی اولاد کو رعایت اور بہتر آسائش دے کر ہی کرنا چاہتی ہیں۔ ان سہولتوں میں وہ بچی کی آزادی کی خواہش کو بھی سلب کر لیتی ہیں اور اپنی تشفی کو بچی کی تشفی ہی پہ محمول کرتی ہیں۔ وہ سارے جہان میں بہت سخت رویے کی خاتون مشہور ہو سکتی ہے، مگر بچی کے لئے وہ تمام تر ذات گھل کر صرف تشفی اور خوشی کا منبع بننے کی کوشش کرے گی۔ لڑکی کو یہی بے تحاشہ توجہ، قید معلوم ہوگی۔ وہ مائیں کہ جو بچی کی عصمت کے تحفظ کا ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہیں۔ وہ لڑکی کو پالتو کتے کی طرح ساتھ ساتھ باندھے پھرتی ہیں۔ ان کے کمرے میں سوتی اور جہاں جاتی ساتھ لے کر جاتی ہیں۔ وہ اپنے اس رویے کی سزا پاتی ہیں اور بچی خطا کھاتی ہے۔

کچھ خواتین اپنے خاتون ہونے پر شرمندہ، شرمندہ سی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو بیٹا کہہ کر پکارتی ہیں اور اس کو لڑکوں کی تعلیم اور آداب سکھاتی ہیں اور عورت ہونے کو لائق تحقیر کہتے ہوئے اسے مردانہ رویے اختیار کرنے کو سختی سے کہتی ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک طوائف اپنی بچی کو کونونٹ سکول بھیجتی ہے۔ جبکہ ایک کونونٹ پڑھی خاتون بچی کو موسیقی سکھانے کو استاد رکھتی ہے۔

مگر اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب لڑکی بالغ ہو کر، ماں سے الگ اپنی انفرادیت اور اپنے وجود کا اعلان کرنا چاہتی ہے۔ یہ انداز اکثر ماؤں کو ناپسند ہوتا ہے اور وہ اسے خودسری اور ناشکری کا انداز کہتی ہیں۔ مائیں اپنی بچیوں پر اختیار کو اسی طرح حاکمیت کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ جیسے مرد، عورت کے اُوپر اپنے حق اور اختیار کو استعمال کرتے ہیں۔ ماں چاہے پیار کرتی ہو یا نہ پیار کرتی ہو۔ بچے کا خود اختیار ہونا اُسے سخت ناپسند ہوتا ہے۔ خاص کر لڑکی کا کہ جسے دنیا اس سے دُور لئے جا رہی ہوتی ہے۔

کبھی اسی حد کو باپ کو گھر میں پابند رکھنے کے لیے لڑکی کے ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے اور لڑکی ماں کے سکھانے پر باپ کو گھر سے باہر نہ جانے پر مجبور کرتی ہے۔ سب سے بڑی بچی عموماً ماں کا شکار بنتی ہے۔ وہ ذرا سی بچی ہی کو سنجیدہ رہنے، سلیقے سے دوپٹہ اوڑھنے اور گھر کا سارا کاروبار سنبھالنے کی مشقت میں دھکیل دیتی ہے۔ وہ اُسے زندگی کی مشکلات اتنے ہولناک اور خوفناک انداز میں بتاتی اور کام کرنے کے لیے اس لیے کہتی ہے کہ زندگی میں آگے چل کر مشکلات کا مقابلہ کر سکے کہ لڑکی زندگی ہی سے خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ عام طور پر ہمارے معاشرے میں گیارہ بارہ سال کی لڑکی کو کھانا پکانا، کپڑے سینا وغیرہ سکھا کر فخریہ بیان بھی کیا جاتا ہے۔ وہ لڑکی کا انداز بھول کر خود عورت کی طرح حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ماں یہ برداشت کرنے کو بھی تیار نہیں ہوتی ہے کہ لڑکی پوری طرح گھر میں اس کی جگہ لے لے اور ہر ایک یہ نام کرے کہ لڑکی ہی سب کچھ ہے۔

اگر کوئی خاتون یا رشتہ دار لڑکی کے خود اختیار ہونے کی وکالت کرتا ہے تو ماں اس رشتے دار سے نہ ملنے کی تلقین بھی کرتی ہے اور ترجیح بھی دیتی ہے۔ اس میں استاد یا وہ ہم عمر لڑکیاں بھی شامل ہیں کہ جو ماں کی نظر میں ایسا رویہ اختیار کرتی ہیں۔ لڑکی کا کھُل کے ہنسنا، رشتے کے بہن بھائیوں سے ملنا بھی ماں کو بے حجابانہ اور تکلیف دہ معلوم دیتا ہے، جبکہ لڑکا، اس قسم کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ تمام مصروفیات جو بچی کو گھر یلو لوریت سے باہر لے جائیں۔ وہ ماں کو بُری لگتی ہیں۔

جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا، خود اختیار ہوتا چلا جاتا ہے، ویسے ویسے ماں کی حاکمیت کم ہوتی جاتی ہے۔ لڑکی کے سلسلے میں تو کچھ مائیں لڑکی کو ایسے بدشکل کپڑے پہناتی اور میک اپ کرنے سے منع کرتی ہیں کہ لڑکی لامحالہ خود سر ہو جاتی ہے۔ یہاں ماں خود کو تنہا محسوس کرتی ہے۔ ماں، چھوٹے بچوں کا اپنے ساتھ لگے رہنے کو، باپ کے سامنے ایک ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کرتی ہے۔ مگر بڑے ہونے کے بعد، بچوں پر اس استحقاق کو اُسی تحکم سے

استعمال نہیں کر سکتی۔ ماں اور بچے کا رشتہ، بنیادی طور پر، خاوند کے ساتھ تعلقات پہ بھی منحصر ہوتا ہے اور میاں بیوی میں "دینے" کا جذبہ کم اور "مانگنے" کا جذبہ بے پناہ ہوتا ہے۔ بالکل یہی اندازِ فکر اگر بچے کی پرورش کے سلسلے میں بھی آزمایا جائے، تو والدین اور بچوں کے درمیان تعلقات خوشگوار نہیں ہوتے، ہاں کئی مائیں، صرف مصروفیت قائم رکھنے کے لئے بچوں کی خواہش کرتی ہیں۔ مگر والدین کے تعلقات کی ناخوشگواری، بچوں کے ساتھ تعلقات کو بھی گہرا اور دیرپا نہیں بناتی یہی بچے اپنے بچوں کی پرورش اور تعلقات کے بارے میں متضاد رویوں کے حامل ہوتے ہیں۔ خاص کر لڑکی تو اپنی ماں ہی کے رویے کا آئینہ بنتی ہے۔

ایک اور تضاد جو ہمارے سارے معاشروں میں کارفرما ہے۔ وہ ہے ماں کی عزت اور عورتوں کو حقیر سمجھنے کا۔ ایک طرف اس کے گھٹنوں میں عقل کا کہنا اور دوسری جانب، آنے والی نسل کی پرورش کی ذمہ داری اُسے سونپ کر خود بری الذمہ ہو جانا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمارے زیادہ علاقوں میں عورت کا پڑھنا، لکھنا، ادب اور آداب سیکھنا، خلافِ معاشرت اور خلافِ تہذیب عوامل سمجھے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہی لڑکیاں کہ جنہیں گڑیاں دے کر اور لڑکوں کو بندوقیں دے کر، بچپن میں تربیت کی جاتی ہے۔ وہی لڑکیاں مائیں بن کر گوشت اور خون کی زندہ گڑیوں اور گڈوں سے کھیلتی اور پرورش کرتی ہیں۔

تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ گھر کے معاملات و مسائل کے مقابلے میں، عورت اور مرد، دونوں ہی بہت متوازن رویہ اپنے دفتری مسائل کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عورت کو کام کا موقع دیا جائے تو وہ مرد کے مقابلے میں نہ صرف برابر بلکہ متوازی رویوں سے مسابقت کا ماحول پیدا کرتی ہے۔ لیکن گھر کے معاملے میں، مرد بھی بیوی کے ساتھ لیٹتا ہے تو عجب جذباتی، غیر ہموار اور کافی حد تک نامعقول رویہ اختیار کرتا ہے، ماں بھی جو دفتر یا باہر کے ماحول میں بہت وسیع النظر کہلاتی ہے گھر کے معاملات میں بہت ہی تنگ نظر اور ناقابلِ یقین رویہ اختیار کرتی ہے اور ماں کا رویہ شوہر کے رویے کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے کہ یہ اگلی نسل پہ پڑنے والے اثرات کی نشاندہی

کرتا ہے۔ اگر عورت کو معاشرے اور گھر میں سکون اور عزت مل رہی ہو گی تو وہ اولاد کے ساتھ کبھی بھی سختی اور حاکمیت کا رویہ اختیار نہیں کرے گی۔

جس دوران، ماں بچے کے دودھ، کپڑوں اور بستر وغیرہ کا اہتمام کر رہی ہوتی ہے۔ اس دوران اُسے علم نہیں ہوتا کہ اس کے پیدا کردہ ماحول کا اثر، بچہ کیا لے رہا ہے۔ عورت کی ساری محنت اور صبر، بچے کے بڑے ہونے پر حرفِ غلط کی طرح بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ ناشکرا ہونے کے رویے کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ کیا مذاق ہے کہ ماں، اپنی محنت اور اپنی زندگی صرف کرنے کے بعد داد کی منتظر دوسرے لوگوں کے ہاتھوں ہوتی ہے، وہ چاہیں تو برداشت کریں نہ چاہیں تو بھلا کون مجبور کر سکتا ہے؟

پورا تجزیہ یہ ثابت کرتا ہے کہ عورت کی کمتری سے بات شروع کرکے، مرد حاکمیت قائم کرتا ہے اور پھر معاشرے کا سارا بوجھ، اس کمتر کے کندھوں پر ڈال کر، صرف افتخار کے موتی اپنے دامن میں سمیٹنے کو تیار ہوتا ہے۔ جو عورتیں، اپنے پیشے یا اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں۔ وہ تو اولاد کی جانب متوقع اور جوابی عنایت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتی۔ مگر جس عورت نے اپنا سب کچھ صرف اولاد کی تربیت میں مرتکز کیا ہو، وہ تو لامحالہ صرف بچے ہی سے توقعات وابستہ کر سکتی ہے۔ یہاں پھر مرد کا رویہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر وہ کما کے لا کر، بیوی کے ساتھ دو ہاتھ بیٹھنے اور دولتیے دینے ہی کو مردانگی متصور کرتا ہے تو پھر ایسے مرد کی اولاد، اس ماں کی کس قدر عزت کرے گی۔ یہ تو ہماری معاشرتی زندگیوں سے بھی ظاہر ہے اور ہمارے بچوں کے دو رُخے رویوں سے بھی کہ ایک طرف تو وہ اعلان کرتے ہیں، ماں کے قدموں تلے جنت ہونے کا اور دوسری جانب اُسی ماں کی رائے کو بھی لائق توجہ نہیں سمجھتے۔ ماں کا وہی پیار، جب گھر کے تحفظ اور نگہداشت کے پلڑے میں تُلتا اور ماں بے توجہی پر ڈانٹتی ہے تو پھر وہی ماں بچے کو پرائی، سوتیلی یا سخت گیر لگنے لگتی ہے اور اگر وہ بے توجہی کرے تو پھر معاشرے سمیت بچے اس کی بے توجہی کو لائق طعن جان کر، حرف گیری کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عورت کو اگر معاش اور معاشرے میں قبولیت اور مساوات حاصل ہو تو وہ ماں
گھر میں بند اور حواس باختہ ماؤں سے بہتر ثابت ہو گی۔ بشرطیکہ، اردگرد کی رشتہ دار خواتین اُس کے
بچوں کو اس احساسِ زیاں اور احساسِ جرم میں مبتلا نہ کردیں کہ ہائے بے چاری کو تمہاری طرف
توجہ دینے کا وقت ہی نہیں ملتا، تم تو بے یار و مددگار پل رہے ہو۔ تمہارا تو اللہ ہی نگہبان ہے کہ ایسا رویہ
ماں کے خلاف زہر بونے کے لئے بہترین اور کارگر ثابت ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ بچے زندگی کی
عملی منزل میں جا کر، اس رویے کی حقیقت کی تحقیق کر کے پشیمان ہوں۔

آج کے مغربی معاشرے کی عورت چاہتی ہے کہ لوگ اس کی بطور گھر والی، بطور بیوی
بطور ماں اور بطور خاتون، الگ الگ سطحوں پر تخصیص کریں۔ یہی اطمینان کی قدر ہے کہ
جو وہ اپنی سماجی زندگی میں تلاش کرے گی۔

سماجی زندگی

ایک خاندان کوئی بند خانہ نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے گھرانوں سے ربط ہی ایک خاندان کے زندہ و شاد باد ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ ایک گھر، دو میاں بیوی کے ایک کمرے میں موجود ہونے کا نام نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک جوڑے کے معیارِ زندگی، مالی حالت، مذاق اور اس کے حسنِ سلوک کا مظہر ہوتا ہے۔ یہاں عورت کا خاص کردار ہوتا ہے۔ مرد یہاں پر دوسرا درایک شہری کی حیثیت سے سماج کی تہذیب میں داخل ہوتا ہے۔ عورت مرد کی سماجی، فنی یا صنعتی تعلق کی بنا پر اپنا ماحول آراستہ و پیراستہ کر سکتی ہے یا پھر اپنے قریبی رشتے داروں کو چھوڑ کر دور کے ان رشتہ داروں سے تعلقات بنا سکتی ہے کہ جن کا سماجی رتبہ ذرا بلند اور نمایاں ہو۔ عورت ہی اپنے نمائش کے انداز کو دوسرے گھرانوں پر اسی اوچھے انداز سے ظاہر کر سکتی ہے کہ جو گھر کے قریبی افراد، بچوں اور میاں کو تو عیب لگ سکتے ہیں۔ مگر خود اُسے یہی بات فخر کے قابل محسوس ہو۔

ویسے عورت چاہے سماجی زندگی میں ہو کہ گھریلو، اس کو اپنے آپ کو پورے طور پر ظاہر کرنا چاہیے۔ یوں تو کچھ مرد، عورت کو بھی ڈرائنگ روم میں سجی دیگر اشیاء کے ساتھ ایک اُسی قسم کی

چیز سمجھتے ہیں۔ عورت بھی گھر کی دیکھ بھال اور آرائش کے ساتھ اُس ذہنی رویے کے ساتھ تیار کی جاتی ہے کہ اُسے خود کو بھی سجانا۔ آراستہ کرنا اور قابلِ دید بنانا ہے اس کا اظہار ہمارے سماجی اور تہذیبی رویوں میں بھی نظر آتا ہے۔ عورت کے مقابلے میں مرد کی دید کا تذکرہ نہ سماجی رویوں میں ملتا ہے نہ ادب میں بلکہ اُسے تو قابلِ دید یوں سمجھا ہی نہیں گیا۔ جبکہ عورت کو شہوانی جذبے اُبھارنے کے لئے بناؤ سنگھار کی تلقین ملتی ہے۔ اس طرح کی اخلاقیات سکھانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ عورت کو بطور ایک فرد معاشرے میں تربیت دی جائے بلکہ اُسے مرد کی خواہشات کے شکار کے طور پر تیار کیا جائے۔ اس طرح معاشرہ عورت کو مزید تحفظ دینے کی بجائے، عورت کو مزید استحصال کے لئے تیار کرتا ہے، مغربی معاشرے میں پتلون سے زیادہ تکلیف دہ سکرٹ ہے، اُونچی ایڑی کے جوتے تکلیف کا باعث ہوتے ہیں۔ مگر سکرٹ میں کھلی اور ننگی ٹانگیں اور اُونچی ایڑی کے حوالے سے چلتے اور مٹکتے کولہے، مرد کی جنسی طلب اور دیکھنے کی ہی گرسنگی کو دُور کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عورتوں کے لئے نازک ہیٹ اور جرابیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں کہ وہ جاذبیت زیادہ اور آرام کم دیتی ہیں۔ اسی لئے پہلے پہل جب بچی کو سکول میں سادہ قمیض شلوار، جرابیں، سیدھی مانگ، لپ سٹک نہ لگانا، قسم کی قیود لگائی جاتی ہیں تو پھر ایکدم جوان ہو کر، وہ ململ کے پتلے کرتے، چوڑے گلے کی قمیض اور چولیاں پہن کر خود کو ماڈرن ثابت کرتی ہیں۔ مغرب کی طرح مشرق میں بھی تنگ پاجامہ اور تنگ قمیض، آسائش سے زیادہ زیبائش کا کام کرتے ہیں۔ اب حد تو یہ ہے کہ برقعے بھی سونے پہ سہاگے کا کام کرتے ہیں اور عورت، اس آگاہی کے باوجود، اسی اسیری کو اپنے لئے زیادہ جاذبیت کا حامل سمجھتی ہے۔

آج کل مرد کی طرح قمیض پینٹ پہننا، ایک طرف تو بغاوت کے آثار ہیں، دوسرے پینٹ کے ذریعہ آگے اور پیچھے سے نمایاں دکھائی کا عمل بھی شریک کار ہے اور ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ لزبین خواتین اس طرح کے ملبوسات زیادہ استعمال کرتی ہیں۔

کچھ خواتین، اپنی ذات سے زیادہ، اپنے ملبوسات اور اپنے جواہر کو اہمیت دیتی ہیں۔

وہ یہ کم دیکھتی ہیں کہ پہنا ہوا کیسا لگ رہا ہے۔ بلکہ یہ زیادہ دیکھتی ہیں کہ کس قدر قیمتی چیز وہ کس وقت اور کتنی زیادہ پہن سکتی ہیں۔ اسی لئے دلہن بناتے وقت مشرق میں، جاذبیت کو کم اور اس امر کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہ سارے سیٹ پہنے ہوئے ہوں۔ عمر بڑھتی جاتی ہے تو آرائش و زیبائش کی خواہش زیادہ نظر آتی ہے۔ بلکہ یوں ہوتا ہے کہ جوانی میں سولہ سنگھار اور لباس بدن اور چہرے کی موزونیت اور جاذبیت کو سوا کرتا ہے تو بڑھاپے میں سنگھار اور زیبائش اتنی نمایاں کی جاتی ہے کہ چہرہ کم اور زیبائش زیادہ نظر آتی ہے۔ ویسے عمومی طور پر معاشرہ ایسی خواتین کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا کہ معاشرہ روایات، نمائش، تہذیب و نفاست کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا پسند کرتا ہے۔

آپ کے منصب یا آپ کے شوہر کے عہدے کے مطابق بھی لباس زیب تن کیا جائے گا۔ دفتر، پبلک یا عوامی تقریبات میں سادہ پہننے والی خاتون، شام کو جب کلب میں نظر آئے تو بالکل ہی مختلف معلوم ہو کہ بالوں سے لے کر لباس تک بہت ماڈرن اور شام کی پارٹی کی ضرورت کے مطابق ہو، اس کا زمین و آسمان جتنا فرق، آپ کو چونکا سکتا ہے کہ یہ قطعی فریب ہو سکتا ہے کہ جو خاتون ذاتی سطح پر کچھ اور اجتماعی سطح پر کچھ اور نظر آنے لگے۔ بہر طور عورت کا لباس اور میک اپ اگر صرف توجہ حاصل کرنے کے لئے نہیں ہے تو یقیناً متاثر کن معلوم ہو گا۔

اب تک ہمارا مشرق و مغرب کا معاشرہ، عورت کے وجود کو اس کے ملبوس اور زیبائش کے حوالے سے زیادہ جانتا ہے۔ عورت ابھی تک اس فریب اور فالتو شرطِ شخصیت سے خود کو آزاد نہیں کر سکی ہے۔ امریکہ اور دیگر ممالک میں کام کرنے والی خواتین کی آمدنی کا بیشتر حصہ اُن کی اپنی آرائش اور لباس پر خرچ ہو جاتا ہے۔ فرانس میں یہ خرچ کافی حد تک کم ہے اور وہاں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ مصروف و معروف عورت، میک اپ اور فضولیات پر خرچ بہت کم کرتی ہے۔

وقار کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ اس وقار کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ خصوصی اور واقعی، مصنوعی سطحوں کو برقرار رکھنے کے لئے، بہت سی امیر گھرانوں کی خواتین، چھپے ہوئے آلات کے ذریعہ، چوری

کرتے ہوئے پکڑی جاتی ہیں۔ "کچھ شریف" خواتین، بالواسطہ روابط و تعلقات کے ذریعہ اپنے مالی استحکام کا سامان کرتی ہیں، اچھا لباس پہننا خوبی ہے، مگر جنون میں تبدیل ہونے کے بعد، ہر وقت بازار میں نئے سے نئے ڈیزائن کے لئے سرگرداں خواتین اور پھر ان کی سلائی کے لئے درزیوں کی دوکانوں پہ چکر لگانے والی خواتین، اس طرزِ فکر کی غمازی کرتی ہیں۔ نئے کپڑوں کا مسئلہ یہیں حل نہیں ہوتا، پھر اس کے ساتھ کے جوتے، میک اَپ، بالوں کا سٹائل اور ڈریسنگ گویا کہ لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اب تو خواتین اتنی خود آگاہ ہیں کہ وہ اپنا وزن کنٹرول کرنا، اپنا جسم سمارٹ رکھنا اور لباس کے مطابق ہم رنگ میک اپ کرنا بھی جانتی ہیں۔ اسی طرح گھر کے کاموں میں اپنی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کا ہنر بھی اُنہیں ہی آتا ہے۔ برتن دھوتے وقت دستانے پہن لینا۔ گھر کی صفائی کے وقت جسم کی حرکت کو ورزش کے انداز میں بدل دینا اور دن کا کام شروع کرنے سے پہلے تھوڑی سی ورزش کرنا، اب تو گھر میں بھی بیٹھنے والی عورت کا معمول بن چکے ہیں۔ خود کو اور گھر کو خوبصورت رکھنا، عورت کی منتہا معلوم ہوتی ہے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ، عورت کو یہ معلوم ہے کہ فلاں ورزش سے گھٹنوں کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے مثلاً میز پر یا بستر پہ بیٹھے بیٹھے صرف پنجوں پر پیروں کی پچاس دفعہ جنبش آپ کی ٹانگوں کو ٹھیک رکھے گی۔ مگر خوفناک حد تک بوڑھا ہونے کا خوف ایسی بے جا باتوں کو زندگی دیتا ہے۔ مثلاً کھانا کھانے سے موٹاپا آئے گا۔ اس لئے کھانا بند اور کبھی توس کھا لیا، کبھی جوس پی لیا۔ زیادہ مُسکرانے سے جھریاں پڑنے کا امکان ہے، اس لئے ہنسنا منع ہے، سورج یعنی دھوپ میں نکلنے سے جلد سیاہ ہوتی ہے۔ اس لئے دن بھر کمرے میں بند پڑے رہو۔ سونے سے بندہ بور ہو جاتا ہے۔ اس لئے سونا منع ہے۔ کام کرنے سے زندگی کا سائیکل کم ہوتا ہے۔ اس لئے کام کم سے کم کیا جائے، پیار کرنے سے آنکھوں کے گرد حلقے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے پیار سے گریز کیا جائے۔ زیادہ بوسوں سے گال سُرخ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اجتناب کیا جائے۔ بچوں کو دودھ پلانے سے چھاتیاں خراب ہوتی ہیں۔ اس لئے بچوں کو دودھ پلانا بند، بغل گیر ہونے

سے گوشت اور جلد کے ڈھلکنے کا خدشہ ہے، اس لئے گریز کیا جائے۔ اسی طرح حمل سے جسم کے بدنما ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ اس لئے یہ بھی ناقابلِ عمل قرار دیا جائے۔

بہت سی نوجوان مائیں، نیا لباس پہن کر، بچے کو قریب آتا دیکھ کر بلا کی طرح چلا کر کہتی ہیں کہ خبردار جو قریب آئے، میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے اور بچے اس لباس سمیت ماں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

مگر ان ساری درج بالا علامات اور خدشات کے باوجود، بالوں میں سفیدی اور ہاتھوں پہ رگوں کا اُبھار، اپنا آپ ظاہر کر کے رہتا ہے۔ عمر کی اس منزل کو سنجیدگی اور فطری طریقے پر قبول کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ بہت سی عورتیں اِس اُدھیڑ عمری میں بھی، نئے لباس نئے ہیئر سٹائل اور نئے زیورات کی داد ضرور چاہتی ہیں۔ ویسے مرد بھی ان کو عمر کے ہر حصے میں یہ باور کرانے میں مصروف رہتے ہیں کہ وہ تو بس سولہ سال کی ہی معلوم ہوتی ہیں یا اُنہیں دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ وہ چار بچوں کی ماں ہیں۔ اسی طرح عورت کے حسن کا سارا کریڈٹ مرد لینا چاہتا ہے کہ اس کی توجہ اور روپے کے اصراف کے باعث، عورت خوبصورت نظر آ رہی ہے۔ اگر اِس بات کو علی الاعلان نہیں مانا جاتا تو پھر میاں کا اندازِ گفتگو طنزیہ اور دوسروں کا مذاق اُڑانا عمومی ہوتا ہے۔ وہی مرد جو دوسری عورت کے بازو اور سینے کی تعریف کرتا نظر آتا ہے۔ وہ خود اپنی بیوی کو اس طرح لباس پہنے نہیں دیکھنا چاہتا ہے اور اعتراض کرتے ہوئے، اپنا دامن بچا کر کہتا ہے کہ میں تو کچھ نہیں کہتا۔ البتہ لوگ کیا کہیں گے۔ اس خیال سے تمہیں نصیحت تمہارے بھلے کے لئے ہی کر رہا ہوں۔ ایک محبت کرنے والے شوہر کے لئے تو عورت چاہے کسی بھی لباس میں ہو، لائقِ محبت اور قابلِ تعریف معلوم ہوگی۔ لباس، مرد کے قریب تر ہونے کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے، مگر کُل نہیں۔ عمر کے گزرنے کے ساتھ، جذبات اور محسوسات جسمانی قرب کی لذت سے معمول کی جانب سفر کرتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک عورت، دیگر خواتین میں حسد کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے منفرد

لباس پہننے کی متلاشی رہتی ہے ۔ یوں بالواسطہ طور پر اپنی خوبصورتی اور اپنے منفرد انداز کو دوسری عورتوں سے منواتی ہے ۔ مشرق میں یہ ریاضت بڑی مشقت چاہتی ہے ۔ عورت چونکہ قطعی طور پر مرد کی دست نگر ہوتی ہے ۔ اس لئے اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ، اُسے مرد کی ہر طرح خاطر، خدمت اور چاپلوسی کرکے ، اپنا زیور یا لباس حاصل کرنا ہوتا ہے ۔ پھر اسی لباس اور زیور کی نمائش کے لئے ، خاص طور پر پارٹی کا انتظام کیا جاتا ہے ۔ اگر شوہر فارغ نہ ہو تو خاتون خود ہی رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنے چلی جاتی ہے ۔ بنیادی مقصد اُس لباس یا زیور کا مظاہرہ ہے کہ جو فیشن کے مطابق نیا نیا بنوایا گیا ہو ۔ اب اس کے اور بھی جدید طریقے رائج ہو گئے ہیں ۔ شام کی پارٹیاں کہ جس میں نئے ڈنر سیٹ ، کھانا پکانے کے نئے طریقے اور گھر میں نئی آرائش کی خوب نمائش ہو سکتی ہے ۔ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں کہ بس تمہاری ہی وجہ سے سب لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور وہ بھی خوب خوش ہوتی ہے کہ لوگوں کو ملانے اور خوش رکھنے کا مرکزی نکتہ یہی ہے ۔

پھر گھر آکر وہ اپنے شوہر کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ فلاں خاتون نے اپنے فن اور اپنی اشیاُ کی نمائش بذریعہ دعوت کی ہے ، اب اُسے بھی یہ مظاہرہ کرنا چاہیئے ۔ یہ سلسلہ اگر طول کھینچے تو پرتگال کی وہ مثال یاد آتی ہے ۔ جب گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد ، پارٹی میں کیک فراہم کرنا عزت و تکریم کی نشانی بن گیا تھا ۔ کیک مہنگا ہوتے ہوتے اس مقام پر پہنچ گیا کہ عورتوں نے خود آپس میں مل کر کیک نہ استعمال کرنے کا عہد کرکے ، خود کو اسی تباہی کے دہانے سے بچایا ۔

مختصر یہ کہ نمائش کی یہ دوڑ ، اگر قابو میں نہ رکھی جائے ۔ تو لا انتہا اور اتنی تکلیف دہ ہوتی ہے کہ عورتیں خود ان سے گھبرانے اور اُکتانے لگتی ہیں ۔ ایک کپ ٹوٹ جائے ۔ ایک پلیٹ میں بال آجائے تو پورا سیٹ خراب ہو جائے اور پھر ایسی شاندار پارٹیوں میں بھلا نامکمل سیٹ کیسے رکھا جائے ۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ نیا سیٹ پھر اس کے ساتھ پیسٹری اور وہ سب کچھ کہ جو بڑی اور شاندار پارٹیوں میں لازم و ملزوم ہے ۔ آخر کو بے چینیاں ، بربادیاں ، پریشانیاں یا تو تارک الدنیا ہونے پر مجبور کرتی ہیں یا پھر اپنی اوقات پر آکر ، خوشی کی خاطر نہ کہ شان کی خاطر ، دوستوں کی

دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

عورت اور مرد، دونوں کو تنہائی کا آسیب یکساں تنگ کرتا ہے۔ مرد تو گھر سے باہر نکل کر نئے رشتوں اور دوستیوں کے تعاقب میں خود کو مصروف رکھ سکتا ہے، مگر عورت گھر کی چار دیواری میں رہ کر اس جشنِ آسودگی کو بھی نہیں حاصل کر سکتی ہے۔ وہ تو صرف خاندان کے ساتھ ہے۔ خاندان نہیں تو اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ گھر میں رہنے والی خاتون نے ذہن کے استعمال کی تربیت بھی حاصل نہیں کی ہے۔ وہ برتن دھونے سے کپڑے دھونے تک جسمانی طور پر مصروف رہتی ہے۔ مگر اس کا ذہن خلا میں ہیولے بناتا رہتا ہے۔ جس سے گھر کا کوئی فرد واقف نہیں ہے اور اس کے تحت الشعور میں بھی یہ بات ہوتی ہے۔ وہ تو تنہائی کے گرداب میں سانس لے رہی ہوتی ہے۔ شادی کے فوراً بعد بھی یہ تنہائی جنم لے سکتی ہے کہ نندوں، دیوروں اور ساس کے بھرے پرے گھر میں شوہر تو یہی سمجھتا ہے کہ بیوی کا دل لگا ہوا ہے، مگر دراصل وہ اتنے ہجوم میں بالکل تنہا ہے۔

ہمجولیوں سے دوستی برقرار رکھنے کی بھی شادی کے بعد ایک کوشش ہوتی ہے جو مردانہ دوستیوں کی طرح بہرحال نہیں چل سکتی کہ ان کے درمیان آپس میں بات کرنے کو سوائے ایک دوسرے کے شوہر کے رویّے کے بارے میں بات کرنے کے اور کوئی خاص باہمی دلچسپی کا مسئلہ نہیں ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ اکٹھی ہو کر، مرد کی شہوت کا مذاق اور اس کی مردانگی کا تمسخر اڑاتی ہیں۔ یہی ان کی تسکین اور یہی ان کے لئے راہِ فرار ٹھہرتی ہے۔ وہ آپس میں حمل، جنس، پیار، بغل گیری، بچے کی پیدائش مرد کے عضوِ تناسل اور پھر بچوں کی نگہداشت اور ساس، نندوں کے رویّے کے بارے میں آپس میں بات چیت کرتی ہیں۔ ایک عورت کھانے پکانے کی ترکیب دوسری کو بتاتی ہے تو گویا اپنے قیمتی راز کو دوسری عورت تک منتقل کرتی ہے۔ گھریلو عورتیں گھریلو قسم کے رسالے جن میں مخصوص میک اپ اور کپڑوں کے علاوہ ایک دو کھانا پکانے کی ترکیب اور دو تین نصیحت آمیز کہانیاں ہوں، زیرِ بحث لاتی ہیں۔

عورت کو ایک بات کا علم ہوتا ہے کہ جو اخلاقیات مرد نے اپنے لئے مرتب کی اور قابلِ عمل جانا۔ اس پر عورت بھی انفرادی طور پر نہیں چل سکتی ہے اور آپس میں عورتیں باتیں کرتے ہوئے مرد کی اسی دو عملی کو نشانہ بناتی مگر اس کے منھ پر کہہ نہیں سکتی ہیں کہ وہ تو خود اپنی روٹی اور روزی کے لئے مرد کی محتاج ہوتی ہیں۔ اگر یہ محتاجی نہ بھی ہو تو سماجی رتبہ اور عوامل ہی آپ کے پیروں میں زنجیریں ڈال دیتے ہیں اور یہیں سے عورت کی دو عملی بھی شروع ہو جاتی ہے کہ وہ مرد سے جو کچھ کہتی ہے اسے معلوم ہے کہ یہ صرف مرد کی انا کی تسلیمات کا معاملہ ہے۔ ورنہ وہ بھی جانتی ہیں کہ دفتر سے سینما یا کلب جانے اور پھر گھر آکر تھکا ہوا ظاہر کرنے والا مرد، واقعتاً تھکا ہوا نہیں۔ مگر وہ جان بوجھ کر اس تماشے کا حصہ بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسے تجربات سے آشنا عورتیں ایک دوسرے کی دوست بھی بنتی ہیں اور پھر وہ اتنی گھل مل جاتی ہیں کہ ان کی پکنک، درزی، ہیئر ڈریسر گویا سارے روابط ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔

بلکہ کچھ عورتیں تو اس دوستی کو مرد سے بے تکلفی اور دوستی سے افضل سمجھتی ہیں۔ شادی کے فوراً بعد اس لڑکی کو بہترین دوست سمجھا جاتا ہے کہ جو پہلی رات کی عینی شاہد ہو۔ لڑکیوں کی آپس کی دوستی، جسمانی قرب اور لذت کا پیرہن بھی بن سکتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے بدن کا جائزہ لیتی ہیں۔ مساج کرتی ہیں۔ خاص کر ایسی عورتیں کہ جو ہوسٹلوں میں رہتی ہیں۔ یا حرم میں داخل ہوں۔ ان کو اپنا وقت مزے سے کاٹنے کو یہ عادتیں بھی ڈالنی پڑتی ہیں۔ مگر جب یہی عورتیں مرد سے تعلق قائم کرتی ہیں تو پھر اس میں کسی قسم کے اشتراک کو پسند نہیں کرتی ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کو پسند کرنے والی مرد کے معاملے میں اپنی اپنی پسند کو محدود بلکہ اس سے تجاوز کو حسد میں بدل دیتی ہیں۔ گھر کی مالکہ اپنی خادمہ کے ساتھ زیادہ قربت محسوس کرتی اور دل کا حال کہہ کر ہلکی ہوتی ہے۔ بہ نسبت اپنے شوہر کے، یہ بات متضاد بھی ہو سکتی ہے مرد بھی نوکر کے سلسلے میں یہی رویّہ اختیار کر سکتا ہے اور پھر نوکر نکالنے کا معاملہ آئے تو جو فرد بھی نوکر سے قریب تر ہوگا، وہی نوکر کو بہترین اور گھر کے لئے لازمی قرار دے گا۔

عورت ایک دوسرے کی دوست ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی سخت ایک دوسرے کی دشمن بھی ہوتی ہے۔ دو دوست عورتوں کی ایک ہی مرد کے ساتھ دوستی ہو سکتی ہے یا ایک عورت کے دوست یا شوہر کے ساتھ اس کی ہی دوست تعلقات بنا سکتی ہے۔ اکثر عورتیں اپنے شوہر کا تعارف، کسی اور بے تکلف دوست سے کرواتے ہوئے ڈرتی ہیں۔

بیشتر خواتین کے لیے۔ مرد ہی ذاتِ کل اور خوشی سے لے کر جنس کے سارے تجربات کا منبع ہوتا ہے۔ بچپن ہی سے لڑکی کی یہ تربیت کی جاتی ہے اور اُسے مرد کی حاکمیت، جبر ضرورت اور تعلق کو سب سے افضل سمجھنے پہ مجبور کیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ باپ، چچا، ماموں یا رشتے دار کہ جو ذرا بھی اُس سے بڑے ہوں۔ اُس کی اخلاقیات کے ٹھیکے دار بن جاتے ہیں۔ مجازی خدا کی ترکیب بھی اسی سماجی ترتیب کی پیداوار ہے۔

ڈاکٹروں کے پاس جاکر، جنسی لذت محسوس کرنے والی خواتین کی تعداد بھی کوئی کم نہیں۔ کافی درمیانی عمر کی خواتین، بھرپور چیک اپ کے بہانے، جسم کے مختلف حصوں پہ مرد کا ہاتھ پھروانے کا طریقہ ڈھونڈتی ہیں۔ اسی طرح کئی جنس کے بارے میں لاتعلق نظر آنے والی خواتین، چیک اپ کے دوران زبردست جنسی لذت محسوس کرتی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ عورت اپنے آپ ہی یہ باور کر لیتی ہے کہ جسم کا جو بھی حصہ اس نے مرد کے سامنے کھولا ہے۔ مرد اس حصے سے بہت متاثر ہوا ہے اور پھر وہ خود کو یہ بھی باور کراتی ہے کہ یہ ڈاکٹر یا پیر فقیر (کہ ہمارے یہاں ان کا رویہ بھی قابلِ توجہ ہے) اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اب وہ اس کی ہدایات کو بڑی توجہ اور حکم برآری کے انداز کے ساتھ سنتی ہے اور پھر اس کی زندگی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں یہ ڈاکٹر یا پیر ایک کنکر کی طرح لرزش پیدا کرتا ہے۔

جو خواتین مرد کی اخلاقیات کو اپنے لئے لازمی اور پابندی بنا کر رہنا چاہتی ہیں۔ وہ تصوراتی ذہنی تعلق قائم کر کے، اس دنیا میں رہتی ہیں۔ جہاں اُن کے بالوں، آنکھوں، جسمانی حسن اور لباس کی تراش خراش کی تعریف کی جائے اور بے پناہ کی جائے۔ اگر وہ شادی شدہ عورت کی

حیثیت سے مطمئن ہوتی ہے تو وہ اپنے وقار کو دوسرے مردوں کی نظر میں ممتاز رکھنے کی آرزومند ہوتی ہے۔ اسے ایک سے زائد مداح حاصل کرنے کا جنون، کشاں کشاں دعوتوں اور پارٹیوں میں ممتاز ہونے کے راستے تلاش کرنے پہ مجبور کرتا ہے۔

یہ راستے تلاش کرنے کی ضرورت، مرد یا شوہر سے انتقاماً برتاؤ کرنے کے باعث بھی ہوتی ہے۔ یہ سوچ کہ میں کوئی اس کی غلام ہوں۔ وہ اپنے آپ کو بہت چالاک یا ہوشیار سمجھتا ہے۔ میں اس کا بھرتہ نکال سکتی ہوں۔ ایسے احساسات ان بیویوں میں بھی عود کر آتے ہیں کہ جو ہم بستری کی نقل و حمل کے باوجود، نہ آسودہ ہوتی ہیں، نہ لذت محسوس کرتی ہیں۔ بلکہ مرد اپنا کام کر کے، اور اپنے تئیں عورت پہ رعب ڈال کر ایک طرف ہو کے نڈھال ہو کر گر پڑتا ہے، ایسی عورتیں مرد کو دھوکہ دیتی ہیں اور دوسرے مردوں تک جانا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ جو لڑکیاں سہاگ رات میں یوں ناآسودہ رہ جاتی ہیں۔ وہ اپنے عاشق کی بانہوں میں نہ تو خوفزدہ ہونے کے امکانات کو ابھرتا پاتی ہیں نہ اپنے بدن کو جھنجھوڑتا ہوا وحشیانہ عمل کا شکار محسوس کرتی ہیں اور یوں وہ شوہر کے مقابلے میں عاشق کی محبت کا دھرا لطف حاصل کرتی ہیں۔

یہ اس باعث بھی ہوتا ہے کہ بیشتر ممالک میں شوہر منتخب نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسرے اُس کا انتخاب اپنی پسند کے مطابق کر کے، لڑکی کے لئے جسے مناسب سمجھتے ہیں، شادی کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ انتخاب خود بھی کرے تب بھی وہ حاکمیت کی طنابیں پکڑے آگے بڑھتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کا لحاظ، تھوڑی سی مسکراہٹ یا محبت بہ لحاظ رشتہ اور بہ ضرورت تعلق دے کر اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ جبکہ عاشق کو تضاد فائدہ پہنچاتا ہے کہ یہاں آزادی کو اختیار کرتے ہوئے، رشتہ بنانے میں احساسِ فرد اور آزادی برقرار رہتا ہے۔ پھر چونکہ دونوں وقت نکال کر ملتے ہیں۔ اس لئے وہ تلخیاں یا رکاوٹیں جو عمومی رشتے میں موجود ہوتی ہیں۔ وہ ان پر مسلط نہیں رہتیں۔ اگر یہ رشتہ یعنی عاشق و معشوق کا تعلق ناگوار ہونے لگے تو عورت اس کو قطع کر کے، دوسرے فرد کے ساتھ اپنے اندر کے خلا کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ممکن ہے کہ ایسے آدمی سے

ملاقات ہو جائے جو اس کے شوہر کے مقابلے میں بھی ہر خامی کو نہ صرف دُور کر دے بلکہ اس کی زندگی کی ساری نامرادیوں کا مداوا بن سکے۔ مثال کے طور پر بڑے گھر میں اور کنبے میں رہنے والی خاتون یہ سوچ سکتی ہے کہ اس کا عاشق اُسے اکیلے گھر میں آزادی سے رکھ سکے گا۔ اس کو دیکھے گا۔ اس کی تعریف کرے گا۔ اس پر والہانہ پن نچھاور کرے گا۔ مگر جب وہ ان اظہارات میں کمی یا تشنگی محسوس کرتی ہے تو پھر رُخ کہیں اور کا کرتی ہے۔ گویا ہم اپنے گناہ کا تجزیہ، ان کے اعداد سے نہیں، بلکہ اس جذبے یا نظریے سے کرتے ہیں کہ جن حالات میں وہ مرتکب ہو رہا ہو۔ مگر پھر عورت کو جنسی آزادی دینے کے تصوّر کو ابھی عالمی برادری نے اس طرح قبول نہیں کیا جس طرح مرد کی جنسی آزادی کو اس کی مردانگی کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔ اگر مرد کا عشق چل رہا ہو تو کبھی کبھی بیوی بھی اس بات پہ فخر محسوس کرتی ہے کہ اس کے شوہر پر دوسری عورتیں مرتی ہیں۔ مگر جب عورت کا عشق چلے تو یہ غیرت کو چیلنج کرنے اور شوہر کے قبضے سے عورت کو کھینچ لے جانے کا عمل سمجھا جاتا ہے۔ ادب میں بھی عورت کا عاشق، شوہر سے کمتر مخلوق بالآخر ثابت کیا جاتا ہے کہ مرد اور وہ بھی شوہر کو، عورت کے رشتے میں سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ عورت اور مرد کی برابری دنیا بھر میں جب تک یکساں تسلیم نہیں کی جاتی، رشتوں کی ناہمواری کا یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔

دوسرے مردوں سے تعلق یا دوستی، ایک شادی شدہ عورت کے لئے اور شادی شدہ عورت کا، مسئلہ بھی ہے اور تقدیر کی زنجیروں کو گلے کا پھندا نہ بنانے کا وہ راستہ بھی کہ جہاں کبھی کبھی تازہ ہوا بھی داخل ہو سکتی ہے۔

طوائف اور مشبوحہ[1]

شادی کا براہِ راست تعلق، طوائفیت سے ہے کہ جسے قدیم ترین زمانوں سے زیرِ بحث لانے سے گریز کیا جاتا ہے۔ سارے مذاہب اور سماجی عوامل، عورت کی عصمت، پاکیزگی اور دوشیزگی پر زور دیتے ہیں۔ بہت سے تہذیبی دائروں میں بدعورتیں، نیک عورتوں کی عزت اور پاکیزگی دکھانے کو قربان کر دی جاتی ہیں۔

ماہرینِ معیشت کے نقطۂ نظر سے صرف وقت کے اصراف کے پیمانے میں عورت کو ناپ کر اس کے پاک یا طوائف ہونے کے پیمانے کو سماجیات کہا جاتا ہے۔ رقم تو گھر پر بیاہ کر آنے والی عورت پر خرچ کرنا، مرد کی ہی ذمہ داری اور اس کی مردانگی قرار پاتی ہے۔ بالکل اسی طرح کرائے پر لی گئی طوائف پہ بھی رقم خرچ کی جاتی ہے۔ مگر ایک مقررہ وقت کے لئے۔ بیوی کو سماج میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ جبکہ طوائف سے رشتے کو راز میں رکھا جاتا ہے۔ طوائف کے حوالے سے رقم کا بدل جنسی ربط کی شکل میں فوری حاصل کیا جانا مقصود ہوتا ہے، جبکہ بیوی تو اپنی ملکیت ہوتی ہے کسی وقت بھی کام میں لائی جا سکتی ہے۔

[1] Hetairas

طوائف بننے میں دماغی تربیت و تہذیب کم اور سماجی ماحول اور برتاؤ زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ طوائف بننے میں، معاشرے اور فرد کی آمدنی کے ذرائع کی محدودیت اور قلت بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے گھروں میں پلنے والی اکثر نوکرانیاں، مردوں کی ہوس کا نشانہ بن کر وہ انجانے میں مسلسل طوائف کا کردار ادا کر کے، ایسے ہی کردار میں خود کو زیادہ مطمئن اور آسودہ سمجھتی ہیں۔ دوسرے شہروں اور دیہات سے آئی ہوئی عورتیں بھی ایسے ہی تعلقات کا شکار ہوتی ہیں۔ دو اسباب کی بنا پر ایک تو یہ کہ وہ اِس اعصابی تناؤ سے آزاد ہوتی ہیں کہ ان کے گھر یا رشتے کا کوئی فرد ان پر نظر رکھے ہوئے ہے، دوسرے وہ خود کو اپنے گھریلو ماحول سے آزاد رکھنے کے لئے اور کیا کریں۔ سوائے اس کے کہ اپنے جسم پر ہی حق خود اختیاری کا بھرپور استعمال کرتی کرتی آخر کو اسی چکر میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔

عصمت اور دوشیزگی ہماری مڈل کلاس کا مسئلہ ہوتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر دیہاتوں اور نچلے طبقوں میں تو لڑکی کا جنس سے آشنا ہونا ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا، بغیر کسی خاص مقصد یا نقطۂ نظر سے صرف بیکار وقت اور موجود مواقع کا بہترین استعمال ہے۔ ڈاکٹر بینرارڈ نے ایک سروے کیا جس میں ۱۰۰ میں سے ایک طوائف نے ۱۱ سال کی عمر میں دوشیزگی کھوئی، دو نے بارہ برس کی عمر میں، دو نے تیرہ برس کی عمر میں، چھ نے چودہ سال کی عمر میں، سات نے پندرہ سال کی عمر میں، اکیس نے سولہ سال کی عمر میں، انیس نے سترہ سال کی عمر میں، سترہ نے اٹھارہ سال کی عمر میں، چھ نے اُنیس سال کی عمر میں اور باقی نے ۲۱ سال کی عمر میں، جنس سے آشنائی حاصل کی، گویا کہ ۵۰ فیصد لڑکیوں کو بلوغت سے پہلے ہی جنس کا شکار ہونا پڑا۔ باقی نصف میں سے نصف نے محبت کے ہاتھوں گرفتار ہو کر اور باقی ناواقفیت کی بنا پر گرفتارِ جنسیت ہوئیں، پہلا تجربہ عموماً ساتھ کھیلنے والے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر جیسا کہ ڈاکٹر بینرارڈ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سپاہی، فورمین یا طالب علم۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر بینرارڈ ہی کے مطالعے کے مطابق اس سروے میں دو وکیل، ایک ماہر تعمیرات، ایک ڈاکٹر اور ایک

فارماسسٹ کا نام بھی آتا ہے۔ عام طور پر آقا یا ملازم رکھنے والا یہ کردار ادا نہیں کرتا، البتہ اس کا بیٹا بھتیجا یا اس کا دوست ہاتھ صاف کر جاتا ہے۔ یہ بھی ایک سروے سے ظاہر ہوا ہے کہ اجنبی گھر میں داخل ہوا۔ یا راستے میں ملا یا کہیں کونے ہی پکڑ کر لے گیا۔ لڑکی پر ہاتھ صاف کیا اور پھر زندگی بھر لڑکی کو وہ شخص دوبارہ نظر نہیں آیا۔ یہ مشاہدہ ۱۲ سے ۱۷ سال کی تقریباً ۵۴ لڑکیوں نے بیان کیا ہے۔ لڑکیوں نے ناواقفیت، جنس اور فرد کی بنا پر نہ اس عمل میں لذت محسوس کی نہ اسے اپنی زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی لانے والا دن قرار دیا۔

البتہ نفسیاتی دباؤ، ایسی لڑکیوں پر حاوی آجاتا ہے۔ کچھ لڑکیاں تمام عمر یخ بستگی کا شکار رہتی ہیں۔ کچھ لڑکیاں اور عام طور پر طوائف بچپن میں جنس سے آشنائی کو ان کے مسلسل جسمانی روابط کا ذمہ دار ٹھہراتی ہیں۔ ایک ۱۴ سالہ طوائف نے کہا تھا کہ جو دروازہ ایک دفعہ توڑ کر کھولا جاتا ہے۔ اس کو پھر بند نہیں کیا جا سکتا۔ جنسیت کے ساتھ ایک لڑکی اُسی لڑکے یا مرد سے ربط جاری رکھنے کی کوشش کرتی ہے کہ جس کے ساتھ تعلقِ بدن قائم ہوا ہو۔ مگر جب یہ ممکن نظر نہیں آتا تو پھر چل سو چل اور حجابات کے پردے ختم۔

چند خاندانوں میں طوائفیت بطور خاندانی پیشے کے نسل در نسل چلتی ہے۔ ایک سروے کے مطابق ... ۵ طوائفوں میں سے ۱۴۴۱ طوائف، غربت کے باعث اس پیشے کو اپنانے پر مجبور ہوئیں ۱۴۲۰ دوشیزگی کھونے کے باعث اس رُخ پہ مجبور ہوئیں، ۱۲۵۵ دنیا میں تنہا رہ جانے پر طوائفیت اختیار کرنے پہ مجبور ہوئیں۔ بیماری یا بیکاری بھی طوائفیت کی جانب، لڑکیوں کو لے آتی ہے، بلکہ مشرقِ وسطیٰ اور برِصغیر میں تو اب یہ مغربی فیشن ایک اعلیٰ سوسائٹی کی قدر کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کچھ عورتیں ایک دفعہ کے جنسی عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کی پرورش کے لیے جسم بیچنے کا عمل اختیار کرنے پر مجبور ہوئیں، ویسے عام سماجی اندازہ یہ ہے کہ طوائفیت جنگ کے دوران بڑھتی ہے یا پھر سماجی قدروں کے رستخیز کے زمانے میں۔

قلمی نام سے ایک طوائف نے اپنا حال کچھ یوں لکھا ہے:۔

" سولہ سال کی عمر میں اپنے سے تیرہ سالہ بڑے آدمی سے میری شادی ہو گئی۔ میرا جی کرتا میں کسی طرح گھر سے باہر نکلوں اور میرا خاوند چاہتا کہ وہ مجھے ہر وقت حاملہ رکھے کہ میں گھر سے نکل ہی نہ سکوں۔ وہ مجھے یا تو میک اپ کی چیزیں لا کے دیتا رہتا یا پھر سینما لے جاتا اور میری ساس ہر وقت میرے سر پر سوار مجھے اس کے سچے اور پرخلوص ہونے کا یقین دلاتی رہتی۔ میں نے حالات کے اسی تسلسل سے تنگ آکر نرسنگ کا کورس کرنا شروع کیا۔ ابھی میں نے کسی مرد سے نہ بات کی اور نہ تعلق قائم کیا۔ چھ ماہ بعد ایک کرخت مگر خوبصورت آدمی میرے کمرے میں آیا اور مجھے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ میری زندگی بدل سکتا ہے۔ ہم دونوں پیرس جا سکتے ہیں اور ہم نے واقعی پیرس میں ایک ماہ بہت آرام اور خوشی کا گزارہ، مگر بعد میں وہ ایک اور خوبصورت لڑکی کو لے آیا۔ میں نے ایک کلینک میں ملازمت کر لی۔ مگر اس شخص نے میرا پیچھا نہ چھوڑا بلکہ تنبیہہ کرتا کہ اگر کہیں گئی تو وہ پولیس کو مطلع کر دے گا۔"

افسانوں، قصوں یا ذاتی کہانیوں میں یہ بیچنے والے کا کردار کبھی شوہر، کبھی دلال، کبھی نائکہ ادا کرتی ہے۔ ایک سروے کے مطابق ۱۰۵ طوائفوں میں سے ۲۸۴ اکیلی رہتی تھیں ۳۲ کسی مرد دوست کے ساتھ اور ۴۹ کسی عورت دوست کے ساتھ کہ جس کے ساتھ ان کے جنسی تعلقات بھی تھے۔

کبھی کبھی عورتیں طوائفیت کو وقتی طور پر آمدنی بڑھانے کا وسیلہ سمجھتی ہیں مگر پھر اس کی زنجیروں میں مقید ہو کر تڑپتی اور جھوٹے وعدوں کی قلعی کھلنے پر شور مچاتی ہیں۔ شروع کرنے کے لئے جو رقم درکار ہوتی ہے وہ یا تو نائکہ فراہم کر دیتی ہے۔ یا دلال۔ پھر اس کے عوضانے میں ساری عمر رقم بٹورنا، ان کا حق بن جاتا ہے۔

بہت سی طوائف، لزبین ہوتی ہیں۔ جرمنی میں ۲۵ فیصد طوائف، لزبین ہیں۔ سکول

کی لڑکیاں بھی ایک دوسرے کو عاشقانہ خطوط لکھ کر ایک دوسرے کے بدن کو ہاتھ لگانے اور ٹٹولنے میں لذت محسوس کرتی ہیں۔ لزبین طوائف کی دوست وہی کردار ادا کرتی ہے کہ جو ایک ساتھ رہنے والا، دلاّل مرد اس کی دلداری، رازداری اور وقت پڑنے پہ ضرورتِ جنس کو پورا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلسل مرد کی باہوں میں رہنے کے بعد، عورت کی باہوں میں گر کر لذتِ دگر حاصل ہوتی ہے۔ ویسے بھی مرد کے خلاف محاذ میں وہ دل و جان سے ایک دوسرے کی شریک اور نفرت کے اس پل کو ڈھانے کے لئے ان کی کوششیں مشترکہ رہی ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں مرد کو شکار کرنے کے لئے جو لباس، وضع، یا حسن آمیزی کی جائے تو پھر اس کی تعریف کرنے کیلئے یہی دو سراہت اور یہی دوستی کام آتی ہے۔

طوائف اور اس کے گاہکوں کے درمیان تعلقات کی بھی بہت سی توجیہات کی گئی ہیں۔ ایک توجیہہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے لئے اپنے منہ کا اصل لعاب اور بوسہ محفوظ رکھتی ہے۔ یہ تک کہ وہ بغل گیری کہ جو اس کے جذبوں کی عکاس ہو وہ بھی گاہک کو نہیں ملتی بلکہ محبوب کیلئے مخصوص ہوتی ہے۔ کئی مرد گاہکوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے کہ طوائف جذبہ یا احساس واقعی طور پر نہ پاتے ہوئے بھی، رقم کے عوض جس ظاہری خود سپردگی اور جنسی تلذذ کا مظاہرہ کرتی ہے، وہ سارا بناوٹی اور خود ساختہ ہوتا ہے۔ اس میں بنیادی سطح اور گہرائی نام کو بھی نہیں ہوتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ ایک گاہک سے دوسرے تک منتقلی اور پھر روز ایک نئے شخص کو سمجھنا اور اس سے ملنا، بذاتِ خود ایک امتحانی مسئلہ ہوتا ہے، جس میں جذباتی تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ البتہ کوئی کوئی رات اور کوئی کوئی شخص ان کے اندر کی عورت کو جگاتا ہے اور وہی رات سینکڑوں بے کار راتوں میں سے کوئی یادگار رات بنتی ہے ایسے ہی خریدار سے وہ پیسے بھی نہیں لیتی اور کبھی کبھی ایسے ہی خریدار سے التجا کرتی ہے کہ وہ اُسے اِس بازاری زندگی سے نجات دلائے۔

طوائف، روزانہ کی شب باشی میں بالکل غیر متعلق اور بے رخ زندگی گزارتی ہے۔ زیادہ تر تحریریں جن میں طوائفیں اور بیاہتا، دونوں شامل ہیں، کبھی کبھی گھبرا کر کہہ اٹھتی ہیں کہ مرد کو ان کے

اندامِ نہانی کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیئے ہوتا ہے۔ بہت سے خریدار، طوائف کو ننگا پھرا کر اُس کا بدن دیکھنے کو، دیگر امور سے زائد اہمیت دیتے ہیں۔ کچھ مرد نخرہ بڑا کرتے ہیں۔ شیشے میں خود کو اور طوائف کو کھڑا کر کے اپنی مردانگی پر اتراتے ہیں۔ کچھ مرد صرف ظاہری بوس و کنار ہی میں آؤٹ ہو جاتے ہیں اور کچھ بس دخول کے قصوروار ہوتے ہیں کہ ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ ساری قسموں کے مرد، تکلیف تو کم دیتے ہیں۔ اگر عورت نہ پہچانے تو کم قیمت ورنہ بہت ٹھگتی ہے۔ پہچاننے والی کے بھی بڑے مسائل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک طوائف، شادی شدہ منضبط زندگی سے طوائف بننے کو اس لئے ترجیح دیتی ہے کہ اُسے معلوم ہے کہ شادی کرنے والے شریف، معصوم اور کم گو ظاہری مرد میں کیسا بھیڑیا، ظالم اور عیار مرد چھپا ہوا ہے۔ مرد، اپنے گھر وہ جنسی طلب مادی نہیں آنے دیں گے۔ جس کا مطالبہ وہ کرائے پر لی گئی یا مل گئی محبوبہ یا طوائف سے کرتے ہیں۔ چومنے سے لے کر اُلٹا ہو کر لیٹنے اور پھر کھڑے ہونے سے لے کر کرسی پہ بیٹھنے کی تمام حرکات کی توقع طوائف سے کرتے ہیں۔ بہت کم مرد بیوی سے ان باتوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ طوائفیں مردوں کے ان حریصانہ رویوں سے سخت نالاں نظر آتی ہیں۔ ان کی عمومی شکایت بھی یہی ہوتی ہے کہ یہی تجربات بیویوں کے ساتھ کیوں نہیں کئے جاتے ہیں۔ شاید وجہ یہ ہے کہ ایک کوٹھے کا تصور، برائی ہے اور اس برائی کے حوالے سے دیگر باتیں کہ جو بری سمجھی جاتی ہیں۔ کوٹھے سے وابستہ کر کے ان کو عملی شکل بھی یہیں آ کر دی جاتی ہے۔ عورت کا ننگے ہو کر کمرے میں گھومنا، مرد اپنی بیوی سے نہیں البتہ محبوبہ یا طوائف سے ضرور مطالبہ کرتا ہے۔

خریداروں کی بھی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ افسران قسم کے خریدار، عورت کو زدوکوب کرنے سے بھی تامل نہیں کرتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خریدار کا ذرا سا بے تکلف ہونا بھی اس کو عورت کے ساتھ بے رحمی سے پیش آنے کیلئے کافی مجرب نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

طوائف کی زندگی کے اولین پانچ سال تو خوب ریل پیل کے سال ہوتے ہیں۔ ۵ سال کے بعد، ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق ۷۵ فیصد طوائفوں سے جراثیم لگ سکتے ہیں۔ ۲۵ فیصد کی حالت

اتنی ابتر ہو چکی ہوتی ہے کہ ان کا آپریشن ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ۲۰ میں سے ایک کو ٹی بی ہو چکی ہوتی ہے۔ ۶۰ فیصد نشے اور شراب کی عادی ہو چکی ہوتی ہیں۔ بہت سی طوائف، احتیاط کے باوجود، حاملہ ہو جاتی ہیں۔ پھر اُلٹے سیدھے طریقوں سے حمل ضائع کرواتی ہیں ایک عام طوائف معاشی، معاشرتی اور جسمانی طور پر ناقابل بیان تکالیف اور اذیت کا شکار ہوتی ہے۔ کبھی اُسے پولیس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی نامہرباں ڈاکٹروں کی چیر پھاڑ کا، کبھی ناآسودہ خریداروں کی تشنہ خواہشوں اور یوں خود کو امراض کے حوالے کرکے، دوسروں کے پیٹ پالنے کے کام پہ جتے رہنا، اس کی زندگی ہوتی ہے۔

ایک عام طوائف اور ایک اُونچے درجے کی سوشل خاتون[لے] میں بڑے درجوں کا فرق ہوتا ہے۔ پہلی خاتون یعنی طوائف تو آپس میں مقابلے کی صورت میں جو گاہک حاصل کرتی ہے۔ اُسی پر گزر کرتی ہے۔ جبکہ دوسری خاتون اپنی انفرادیت منوانے کا عمل اختیار کرتی ہے، خوبصورتی گداز اور دل آویزی کے علاوہ بھی کوئی ایسی خاص بات کہ خاتون کی انفرادیت سب حلقوں میں مسلمہ رہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ایسی خاتون کی شناخت اس کا گھر مالک ہونا، گاڑی چلانا بہت سے ہیرے جواہرات کا مالک ہونا، جائیداد والی ہونا، کسی بڑے حاکم یا بادشاہ کی بیوی رہی ہونا، وغیرہ قسم کی خصوصیات تھیں۔ اب زمانہ ذرا بدل گیا ہے۔ اب زیادہ عورتوں کے پاس ہیرے جواہرات اور جائیداد ہوتی ہے۔ اب اندازِ دلبرائی بدل گئے ہیں۔ اب وہ فنکار بن کر اپنی انفرادیت کا حصار قائم کرتی ہے۔ ظاہراً ایک شوہر کی پابند ہو کر اپنے مداحوں کے شوقِ وصال کو بھڑکا کر اپنی قیمت اور قدر کو اور بھی فزوں کرتی ہے۔

لے عنوان میں ہم نے انگریزی لفظ Hetairas استعمال کیا ہے۔ یہ ایسی عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ جو طوائف، داشتہ یا دوسری بیوی سے مختلف مگر مردسے جنسی رشتہ استوار کرنے میں بہت مہذب اور خود آگاہ خاتون ہوتی ہے۔ اُسے ہم مشہورہ کی اصطلاح سے یاد کریں گے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ فن اور طوائفیت میں ہمیشہ ایک باریک سا رشتہ رہا ہے کہ خوبصورتی اور جنس دونوں طوائف کی جھولی میں ہوتے ہیں۔ جسم کی عریانی کی نمائش کو مصوروں اور سنگ تراشوں نے، خطِ فن کی مستقیم کے لئے لازمی اور ضروری جانا جو فوٹو گرافر، عریاں تصاویر اکٹھے کرتے تھے۔ انہوں نے عریانی کو پاکیزگی کا نام دیا۔ قحبہ خانے میں بھی، رات کے ساتھی کے انتخاب کے لئے جو پریڈ ہوتی ہے۔ اُسے بھی فنی موشگافیوں کا نام دیا جاتا ہے۔

جو طوائف، انفرادی فنی عروج چاہتی ہے۔ وہ صرف اپنے بدن پر چڑھے گوشت کو عریاں نہیں کرتی ہے، بلکہ وہ اپنی ہنرمندی کو سلیقے کے ساتھ آراستہ و پیراستہ کرتی ہے۔ قدیم یونانی تہذیب میں بانسری بجانے والی اور گانے والیاں، اپنے رقص و موسیقی سے لوگوں کو مسحور کرتی تھیں۔ بیرد چائنہ[1] میں ہسپانوی لڑکیاں اور الجزائری عرب خواتین ڈانس ڈی وینچر[2] میں اور زولا کی نانا، محافظ کی تلاش میں، یہ ساری خواتین مسحوریت کے حوالے سے متوجہ کرنے کا عمل کرتی ہیں۔ کچھ نائٹ کلب تو بالکل قحبہ خانوں کی طرح ہی چلتے ہیں۔ وہ تمام شعبے کہ جہاں عورت نمائش کے لئے ہو، وہ شان و شوکت کے مظاہر کے لئے بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں بے شک پیشہ ور خواتین جن میں رقاصائیں، ماڈلز، مجرا کرنے والی، کوٹھا سجا کر گانے اور ڈانس کرنے والی طوائفیں شامل ہیں کہ جو پیشہ اور لطف و محبت کی زندگی کو الگ الگ خانوں میں رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ جو عورت باہر کام کرنے جاتی ہے، وہ عورت اپنے آپ کو دیگر عورتوں کے مقابلے میں سلیقے سے سنوارتی اور رکھ رکھاؤ سے پیش کرتی ہے۔

چاہے اس کا نام سنڈریلا ہو یا قلوپطرہ، اُسے اپنی زندگی میں ایک عاشق ایک محافظ،

---

[1] Barrio China

[2] Dar.ce De Ventre

شوہر یا ساتھی کی ضرورت تو رہتی ہے اور ضرورت اس امر کا مطالبہ کرتی ہے کہ بہ مقابل اور اور بھی خوبرو اور بھی جاہ والا اور بھی مرتبہ رکھنے والا ہو۔

میں نے مشبوحہ کا لفظ ان خواتین کے لیئے استعمال کیا ہے کہ جو اپنی جنس، ذات اور انفرادیت کے مجموعے کو ایک مستحکم شخصیت اور بنیادی جز کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ ان کا رویہ، کسی فنی استعداد کی مالک خاتون سے مختلف ہوتا ہے کہ فنی صلاحیت ان کھڑکیوں کو بھی وا کرتی ہے کہ جہاں سے نظارہ جہاں، وحدانیت کو اور قریب کر دیتا ہے۔ جبکہ داشتہ یا بیسوا، نظارۂ جہاں کو اپنے اندر مرکوز کر دینے کے جنون میں مبتلا ہو کر، اپنی ہی ذات کی سربلندی کو، مقصدِ حیات بنا لیتی ہیں۔ وہ مرد کو مسحور کر کے اپنے دام میں گرفتار کرنے کو اپنا عروج سمجھتی ہے۔ یوں وہ مختلف قسم کے افراد سے مل کر اپنا ذاتی اعتماد بحال تو کرتی ہے۔ مگر اندر سے کھوکھلی ہوتی ہے اور یہ جانتی ہے کہ وہ کسی کے ساتھ یقین کے ساتھ منسلک نہیں ہے۔ وہ زر اکٹھا کرتی جاتی ہے، اس کا نام، مردوں کیلئے لائق رشک ہوتا جاتا ہے۔ قیمت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ بہت مقبول ہوتی جاتی ہے۔ مگر اندر کی تنہائی کا احساس بھی گمبھیر ہوتا جاتا ہے۔ جاپان کی گیشا گرلز کو دیگر جاپانی خواتین کے مقابلے میں زیادہ آزادی حاصل تھی۔ مگر ان کا مقام کیا تھا؟

ذہنی طور پر آزاد اور معاشی طور پر مستحکم خواتین کا رویہ بھی مردوں کے لیئے قابلِ رشک ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر آزاد ہو کر گفتگو اور میل جول میں برابری کا رویہ رکھتی ہیں کہ جس کو مرد یقین کی سطح پر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔

مرد حضرات، مشبوحہ خواتین میں اپنے فنِ مصوری، سنگ تراشی، ماڈل اور خیالات کی پذیرائی کی تمام سطحیں دریافت کر لیتے ہیں۔ وہ شاعروں کی محبوبہ بھی بنتی ہے اور کہانی نگاروں کے خیالات کی مرکزیت بھی اور یوں یہ عورتیں، مرد کی کمزوریوں کو سمجھ کر استعمال کرتی ہیں بہت سے حاکموں کی بیویوں نے، عشق کے دام میں دوسرے علاقے کے حاکموں اور سربراہوں

کو پھانس کر، حکومتوں کے تختے اُلٹے ہیں ۔

عورت اپنے احساسِ کمتری کو رقم بٹورنے اور مرد کا استحصال کرنے کے حوالے سے زائل کرنا، عین واجب الیقین سمجھتی ہے۔ اپنے محبوب سے تحائف وصول کرنے والی کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عشق کے تصدق کس قدر اور جسم کے خراج کے طور پر کس قدر تحائف وصول کر رہی ہے۔ یوں مرد تو سمجھتا ہے کہ تحفہ دے کر، اُس نے کلی اختیار کا تعویذ حاصل کر لیا۔ مگر یہی عمل وہ کئی ایک مردوں کے ساتھ برابر کر رہی ہوتی ہے۔ اسی لئے ایسی عورتیں یخ بستہ[۲] بھی معلوم ہوتی ہیں کہ وہ اپنے جذبات، دل اور عقل پر مکمل گرفت رکھتی ہیں۔ اور بغل گیری، بوس و کنار ضرورت، وقت کے مطابق ناپ تول کر کرتی ہیں۔ اس طرح کوئی خاص ان کا محافظ یا دعویدار نہیں ہو سکتا ہے۔ ہاں ان کی مرد کی ضرورت بہت واضح معلوم اور فوری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہے کہ مرد اگر بددل ہو جائے تو وہ تمام تحائف واپس بھی مانگ سکتا ہے کہ جو اُس نے روابط کے دوران دیئے تھے۔ ان خدشات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے۔ وہ عورت، شادی شدہ عورت کی طرح وہ سارے ضوابط اور طریقے اختیار کرتی ہے کہ جو مرد کو اس کا محافظ اور دعویدار بنائے رکھتے ہیں ۔ وہ اپنی خوبصورتی اور خاص کر بدن کی بڑی حفاظت کرتی ہے۔ اگر اس کی عزت ویسے بھی ہوتی ہے تو وہ اپنے بدن اور چہرے پہ عمر کی پرچھائیں سے بہت خوفزدہ نہیں ہو گی۔ ہاں خوفزدگی اس لئے ہو گی کہ سارے عالم میں عوامی مقبولیت کے درجات میں کمی آ جائے گی، جیسا کہ ہالی وُڈ کے فلمی ستاروں یا پاکستان کے فلمی ستاروں کو بھی ہوتا ہے اور وہ اپنی اولاد یعنی بیٹے کو بھائی اور بیٹی کو بہن کہہ کر اپنی عمر چھپاتی ہیں۔ ہالی وُڈ کے فلمی ستاروں

لہ جیسے کچھ عورتیں، شادی صرف ذاتی اور انفرادی مقصد کے لئے کرتی ہیں۔ کچھ عاشق اپنے سیاسی اور سماجی مفادات کی خاطر بناتی ہیں۔

۲ے Frigid

کے چہرے، بدن اور رنگت بھی پروڈیوسرز کی محتاج ہوتی ہے۔ وہ اپنی مارکیٹ کی ضرورت کے مطابق ان کا چہرے کا انداز، بالوں کا رنگ، گالوں کا ابھار اور سینے کا تناسب بدلتے رہتے ہیں۔ وہ تو اُن کی خوراک کنٹرول کر کے، ان کو ایک متناسب وزن کا پابند بناتے ہیں اور زبردستی روزانہ ورزش کرا کر، بدن کو چست رکھنے کی مشق کراتے ہیں۔ وہ عورت جو اپنا بدن بیچتی ہے اور طوائف کہلاتی ہے، وہ کم مشقت کا شکار ہوتی ہے بہ نسبت اس خاتون کے کہ جو اپنے بدن کی پبلسٹی کے حوالے سے رقم کماتی ہے اور اس بدن کو چست رکھنے کے لئے، فاقہ کشی، ورزش اور طرح طرح کے نسخے استعمال کرنے پر مجبور رہے۔ وہ خاتون کہ جو موسیقی، رقص، اداکاری کے ہنر میں مشاق ہو گئی ہو وہ بیسوا کے کردار سے بچ جاتی ہے اور اپنے منفرد انداز کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ وہ سب زیادہ تر مخفی لفظوں کے حوالے سے، کسی نہ کسی دام میں گرفتار رہتی ہیں۔ ان کو عوام اور خصوصاً مردوں میں شہوت کے جذبات انگیخت کرنے کی ایسی ذمہ داری سونپی جاتی ہے کہ وہ تمام تر قوتیں اپنے چہرے اور بدن کو جوان رکھنے پر صرف کر دیتی ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے امیرانہ ٹھاٹھ کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اب وہ اپنی بچی کو کونونٹ میں پڑھانا چاہتی ہے اور جو کچھ وہ کرتی رہی ہے، لڑکی کو اس سے گریز کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ اگر اداکارہ ہے تو لڑکی کو بالکل اداکارہ نہ بننے کا مشورہ دے گی، اگر مغنیہ ہے تو اس پیشے سے منحرف ہونے کا مشورہ دے گی اور اپنی بیٹی کو اتنی ہی رجعت پسندی کے ساتھ پالے گی۔ جس قدر متضاد قدروں پر وہ خود پلی ہو۔ جنگ کے دنوں میں یہی خواتین، سب سے زیادہ جوش اور حب الوطنی کا مظاہرہ کریں گی۔ جذبات کی اس پاکیزگی اور جذبے کے اس والہانہ پن کے ساتھ وہ روسا اور امرا خواتین کا مقابلہ کرتی ہیں۔ جھوٹ اور فضول خرچی کے درمیان، ان کی زندگی کی ساری قدریں مرصع ہوتی ہیں۔ گویا کہ مشبوحہ کی ساری عمر، ایک شو، ایک منظر نامہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے سارے فقرے سارے اظہارات، اس کے جذبات کے غماز کم اور ضرورت وقت کے زیادہ عکاس ہوتے ہیں۔ تشہیر کے پھندے میں

گرفتار یہ عورت ۔ خود کو وہی سمجھنے لگتی ہے ۔ جو کچھ اس کے بارے میں لکھا جاتا ہے ۔ یہ تک ہوتا ہے کہ زندگی میں کوئی نازک اور ناگفتہ بہ لمحہ ، اس کو عشق کی لذت اور خود کو کسی کے سپرد کر دینے کے مجنونانہ جذبے سے ہمکنار کرتا ہے ۔ مگر پھر معاشرے میں کسی ایک مرد کے ساتھ تعلق پیدا کر کے ، ایک بڑی مارکیٹ سے منقطع ہو جانے کا تصور ، اس کو اس لذت سے کنارہ کش رکھتا ہے ۔ گویا اس کی آزادی نفیٔ ذات اور نفیٔ اختیار پر مبنی ہوتی ہے ۔ وہ اپنے رویے کو واضح کرنے کے لئے مردوں سے سختی سے اور عورتوں سے دشمنانگی سے پیش آتی ہے ۔ وہ اپنی نرگسیت کو قائم رکھنے کے لئے ، معاشی اور معاشرتی دونوں سطحوں پر قربانیاں دیتی ہے ۔

پختہ عمری سے بڑھاپے کی جانب

عورت کی ذاتی زندگی کی داستان ـــــ کہ وہ اب بھی اپنے نسوانی کردار کے حصار میں ہے اس کا انحصار، مرد کے مقابلے، عورت کے کردار پر زیادہ ہوتا ہے کہ عورت کی زندگی میں مختلف موڑ، مرد کے مقابلے میں زیادہ ہوشربا اور حیران کن ہوتے ہیں۔ لگتا ہے کہ ایک دور ٹھہرنے کیلئے آیا ہے۔ مگر اچانک تبدیلی یعنی بچپنے سے بلوغت، بلوغت سے جوانی، جوانی سے حمل، شادی اور پھر بچہ پیدا کرنے کی کیفیت اور پھر اس کے بعد حیض بند ہونے کے اثرات، یہ ساری تبدیلیاں عورت پہ گزرتی ہیں۔ جبکہ مرد آہستہ آہستہ اپنی جوانی کھوتا ہے اور بڑھاپے کی سمت رواں ہوتا ہے۔ عورت کا حسن اور تخلیقی قوت کھونے کا واقعہ، مرد اور زمانے کے نزدیک زندہ رہنے کا جواز ختم ہونے کا اعلان ہے۔ بغیر خوشی اور بغیر کسی مستقبل کی توقع کے، اس کے سامنے آدمی سے زیادہ زندگی، محض زندہ رہنے اور سانس لینے کا نام ہوتا ہے۔

"خطرناک عمر" جسمانی تغیر و تبدل کا دوسرا نام ہے۔ جسمانی تبدیلی کی اس منزل کو وہ عورتیں اس قدر ہیجان خیز نہیں سمجھتی ہیں کہ جو جنس کے علاوہ بھی زندگی کے دوسرے کاموں میں خود کو

مصروف رکھتی ہیں بلکہ وہ تو حیض کی ماہانہ قید و بند سے آزادی کو خوشی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے سکون محسوس کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسان عورتیں مزدور اور دفتروں میں کام کرنے والی عورتیں، وہ عورتیں کہ جو مسلسل زچگی کی اذیت سے نالاں ہوں۔ یہ تمام عورتیں، حیض بند ہونے کو اپنی آزادی کی ایک منزل متصور کرتی ہیں۔

البتہ ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس منزل کے آنے سے پیشتر ہی بہت سی خواتین اس کیفیت کے تذبذب میں خود کو غلطاں پاتی ہیں۔ مرد بھی جنسی تلذذ کے ہیجانی اور لمحاتی اثرات سے نکل کر سنجیدہ زندگی کی جانب رواں ہوتا ہے۔ چونکہ یہ سنجیدگی اس میں عضلاتی تبدیلی نہیں لاتی ہے۔ اس لئے اس کی جسمانی اور ظاہری ساخت بدستور پرکشش رہتی ہے جبکہ عورت میں ۳۵ سال کی عمر کے بعد، سارے حجابات ختم ہو کر شخصیت کی طنابیں کھل رہی ہوتی ہیں اور اب وہ جنسی لذت کے بھرپور حصول کی خواہش بھی رکھتی ہے اور اس کی لذت میں ڈوبنا بھی جانتی ہے۔ اب وہ اپنے محبوب یا شوہر کی آرزو بھی کرتی ہے اور اس کی بغل گیری میں ہمہ گیری محسوس بھی کرتی ہے۔ وہ سفید ہوتے بالوں کو کالا کرتی ہے، پلاسٹک سرجری کراتی ہے۔ اپنی جلد کی حفاظت کرتی ہے۔ تا آنکہ وہ لمحہ آتا ہے کہ جب وہ حیض کے بند ہونے کو جنسی زندگی کے ختم ہونے کا شاخسانہ سمجھ لیتی ہے۔ خاص کر نرگسیت کی ماری ہوئی خواتین، اس تبدیلی کو المیہ بنا ڈالتی ہیں۔ ان کے لئے زندگی کی ساری مصروفیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مرد کے سامنے پیش کرنے والی مسحوریت فنا ہو جاتی ہے۔ اب ماضی کا آئینہ ہی زندگی کی لکیریں کھینچنے کے لئے کام آتا ہے اور زندگی، ناآسودہ خواہشوں کا خواب بن جاتی ہے۔

جو خواتین زندگی کے اس فیصلے کو قبول نہیں کرتی ہیں۔ وہ بالکل نوعمر لڑکیوں کی طرح اپنا اندازِ عمل اور گفتگو بنا لیتی ہیں اور ان کا فلسفہ یہ ہوتا ہے کہ پلک جھپکتے ہی ان کی نوجوانی گزر گئی۔ اس کا ذمہ دار وہ اپنے شوہر، اپنے ماحول اور اپنے کام کو ٹھہرا کر، خود کو بری الذمہ قرار دیتی ہیں۔ وہ خود کو موجود ماحول سے الگ اور برتر سمجھ کر، بات کرتی ہیں اور ہر ممکن کوشش یہ ثابت کرنے

کی کرتی ہیں کہ وہ بالکل مطمئن اور سرگرم نوجوان خاتون ہیں ۔ البتہ اپنی تنہائی میں بالکل نوجوان لڑکی کی طرح خوابوں کے تار بنتے ہوئے ، اپنے ناآسودہ جذبوں کو خیالوں میں آسودہ ہوتے محسوس کرتی ہیں اور اب جوانی کے قصے مسحور کن انداز میں دوسروں کو سناتی ہیں۔[1]

جو عورت ماں بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ حیض بند ہونے پہ بھی بضد رہتی ہے کہ وہ اب بھی ماں بن سکتی ہے ۔ ایک جذباتی عورت ، ایک اور محبوب تلاش کرنے پر بضد رہے گی ۔ بوالہوس ، دامِ عشق کے لئے پریشان رہے گی اور کچھ نہیں تو لباس کی تراش خراش میں یہ نوجوانوں کا سا انداز اختیار کرے گی ۔ خوشبوؤں اور رنگ و آمیزے سے اپنا پیکر تراش کر وہ بہت خوش ہوگی ۔ مردوں سے لڑکیوں کے سے انداز میں بات کر کے اور معصوم انداز سے دیکھ کر سحر پیدا کرنے کی کوشش کرے گی ۔ گویا وہ زندگی کا نیا انداز ، ان ہی خطوط پر استوار کرتی ہے ۔

مگر یہ ساری باتیں ، خود کو دھوکہ دینے کا عمل ہیں ۔ کچھ عورتیں اپنے چھوڑے ہوئے شوق اور فنون ، پھر آزماتی ہیں ۔ تصویریں بنانا ، لکھنا ، سنگ تراشی ، سیاحی ، غیر ملکی زبانوں کا سیکھنا ، گویا ہر وہ بات کہ جس سے اس نے نوجوانی میں گریز کیا ہو ، اُسے کشادہ دلی سے زندگی کا حصہ بناتی ہے ۔ اب وہ اپنے شوہر کی ہر بات بڑے محبوبانہ انداز میں مانتی ہے ۔ ان عورتوں میں ایک اور کیفیت سر اُٹھاتی ہے اور وہ ہے ماسٹربیشن کی کیفیت ، چالیس سے پینتالیس سال کی عمر کی عورتیں آپس میں یا اکیلی ماسٹربیشن کرنے میں لذت محسوس کرتی ہیں ۔ کئی عورتیں گھریلو ماحول کی یکسانیت سے فرار حاصل کرنے کے لئے آپس میں ملنے کو شوہر

---

[1] ہیلن ڈوشے نے ایک عورت کا قصہ لکھا ہے کہ اس نے بہت کم عمری میں طلاق لے کر ایک اور جگہ شادی کر لی ۔ پینتالیس سال کی عمر میں اُسے ایک دم پہلا شوہر اور اس کا رویہ اتنا یاد آنے لگا کہ وہ اکثر اوقات رونے لگتی ۔ اس صورت حال پر اس کا نفسیاتی علاج کرایا گیا ۔

کے ساتھ جنسی زندگی سے زیادہ پُرکشش سمجھتی ہیں۔ گویا کہ حیض بند ہونے کے بعد، لازمین
جنسیت کے رویے کہ جنہیں بچپن سے عورت اپنے اندر دبا کر رکھتی ہے۔ زبردست طریقے
پر عود کر آتے ہیں۔ گھر اور جنس کی یکسانیت سے تنگ آکر، اس عمر کی عورت گھر سے
باہر رہنے، دوستوں سہیلیوں کو ملنے اور گھر کے موجود ماحول سے فرار حاصل کرنے کو بھی بہتر
اور خوشگوار سمجھتی ہے۔ مگر وہ عورت کہ جو بہتر ماحول اور آداب میں پلی بڑھی ہو۔ وہ ایسے رد ّیوں
پر نہیں اُترتی ہے۔ وہ بچّوں کے ساتھ بہت محبّت اور توجہ کا روّیہ اختیار کرتی ہے۔ یہ بھی ہوتا
ہے کہ اُسے اپنے ساتھ زنا ہونے کا خوف گھیر لیتا ہے۔ اس کے اندر طوائفیت کی خواہش بھی
اجاگر ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ خواہش اور پریشانی کے اختلاط اور آویزش سے ایک ایسی شخصیت
بھی جنم لے لیتی ہے کہ جو دوسروں کے معاملات کو سکینڈل میں بدل کر بھی تسکین حاصل کرتی
ہے۔ یہ صورتِ حال بلوغت کے آغاز کی صورتِ حال سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ مگر اس وقت
یہ زعم ہوتا ہے کہ میں عورت بننے والی ہوں اور اب یہ وہم کہ میں عورت پن کی منزل سے
دور جا رہی ہوں۔ اب مجھے پیار کرنے والے کم ہوں گے۔ یہی وسوسے سراب پیدا کرتے
ہیں اور ۴۰ سے ۵۰ سال کی عمر کے دوران، ایسے خیالات حاوی رہتے ہیں۔

ویسے یہ ایک دائمی حقیقت اور تمام عورتوں کا مسئلہ نہیں ہوتا ہے۔ کچھ عورتیں کہ جنہیں
زندگی بھر محبت نہ ملی ہو، وہ خدا کی عبادت میں اس محبّت کی تلاش شروع کر دیتی ہیں۔
بلکہ بہت سی خواتین تو حیض کے بند ہو جانے کے بعد باقاعدہ نمازن ہو جاتی ہیں۔ اس
حد تک کہ خود کو خدا کے مقرّبینِ خاص میں سمجھنے بھی لگتی ہیں۔

اسی زمانے میں عورت ہر قسم کے خیالات بڑے دھیان سے سنتی ہے اور بڑی روحانیت
کا مظاہرہ بھی کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو معجزے سنانے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ ان روحانی عوامل
کے علاوہ، دنیاوی معاملات یعنی تجارت، نوکری و دیگر معروضیات میں بھی خود کو جذب
کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ گویا اس زمانے میں وہ خود کو کل عقل، سچائی اور مہارت کا نمائندہ

متصور کرتی ہے۔ گویا زمینی رشتوں سے ماورا، آسمانی روابط پر اعتقادات کا راستہ کھل جاتا ہے۔

عمر گزرنے کا عمل لمحہ بہ لمحہ جاری رہتا ہے۔ اب جذباتی اور جنسی ہیجان پہ غصہ دلانے والے گلینڈ محیط ہونے لگتے ہیں۔ اب کھانا کم کرنا، کپڑے ایسے پہننے کہ عمر کم لگے۔ اگر اس کی ہم عمر بہن یا دوست ہے۔ اس کے ساتھ بیتی عمر کے قصے دھرانے میں زیادہ وقت گزرتا ہے۔ اس عمر میں ہی مرد سے حسد کا مادہ خاص طور پر اپنے شوہر سے حسد کا مادہ بہت فروغ پاتا ہے۔ ۴۵ سے ۵۰ سال کی عمر کی عورتوں میں ایسے نفسیاتی عوارض عام ہوتے ہیں۔

جو عورتیں، بڑھاپے کو ذہنی طور پر تسلیم نہیں کرتیں، ان کے لئے حیض کا بند ہونا ایک مسلسل عذاب اور جانکنی کا مسئلہ رہتا ہے۔ اگر عورت کے پاس سوائے جسمانی حسن کے اور کچھ مصروف رکھنے کو نہیں تو وہ اب جسم کی ضرورت یعنی جنسی لذت اور خواہش کو اور بھڑکائے گی۔ ایک دفعہ شہزادی میٹرنخ سے کسی نے پوچھا کہ کس عمر میں جا کر عورت کو اپنے بدن اور گوشت سے لذت اور لمس کی مہک آنی بند ہو جاتی ہے۔ اس نے جواب دیا "مجھے نہیں معلوم، میں تو صرف ۶۵ سال کی ہوں۔ اس کے خیال میں شادی تو لمس و لذت کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ جو بالجواب، وقت کے ساتھ عورت کو احساسِ عمرِ گزشتہ کے اور کچھ نہیں دیتی۔ وہ تو لڑکی سے عورت بننے اور جسم کی لرزشوں کو پہچاننے میں ابھی ذرا آگے بڑھی ہوتی ہے کہ مرد اس کی جانب سے لاپرواہ ہو جاتا ہے اور اپنی مصروفیات کے دائرے سے باہر عورت کے وجود کو مرکوز کرتا ہے۔ عورت دوسری طرف اپنی تحمل مزاجی، دوستی اور ذہنی ہم آہنگی کو کہ وہ کسی بھی عمر کے اور کسی بھی ملک و نسل کے آدمی یا نوجوان کے ساتھ ہو جائے، متبادل رشتوں میں منتقل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مشہور عورتوں کے ساتھ شرمیلے مگر تگڑے جوان ملنا، اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ایک تو انہیں یہ فخر حاصل ہوتا ہے کہ وہ فلاں عورت کے ساتھ رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کی اپنی مردانگی کے جوہر بلا کسی خوف کے ان پر خود کھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

ایک اور کیفیت جو اس عمر کی عورت پہ حاوی آتی ہے۔ وہ یہ کہ خاتون تحائف مانگنا یا

لینا شروع کر دیتی ہے۔ جتنے ملنے والے، اتنے ہی تحائف، حتیٰ کہ ساری الماری بھر جاتی ہے۔ اب پھر تحائف دینے کی نفسیات حاوی آتی ہے۔ حتیٰ کہ سارے تحائف دے کر نئے خرید کر رکھے جاتے ہیں کہ یہ اضطراری عمل تسکین پا سکے۔ پیسہ بھی عورت کو افتخار اور تسکین دینے کا ذریعہ بنتا ہے کہ یہ اس کی خود مختاری کا ایک عمل بنتا ہے۔

مگر پیسہ، عورت کو بے وقوف بنانے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے فیاضی اور نوجوانوں سے دوستی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جبکہ نوجوان بالواسطہ طور پر اس کا استحصال کرتے، لوٹتے اور اپنے تئیں عیش کرتے ہیں۔

مگر جس دن سے عورت، بڑھاپے کی آمد کو تسلیم کر لیتی ہے۔ صورتِ حال تبدیل ہو جاتی ہے۔ اب اس میں جنسیت مفقود اور تکمیل کا ذائقہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ مگر زندگی کا راستہ اب بھی کٹھن رہتا ہے کہ اُسے اپنے وجود کی جنگ، اس روئے زمین پر اب بھی لڑنی پڑتی ہے۔ اب اس کا میاں بھی اس کے رویّوں کو شکوک بھری نظروں سے نہیں دیکھتا ہے۔ بلکہ اب وہ یہ پہچانتی ہے کہ کن لمحوں میں شوہر کیلئے صرف بوسے یا بغل گیری، دن بھر کی لذت کے لئے کافی ہوں گے۔ اب وہ لباس کی خصوصیت اور جسم کو سمارٹ رکھنے کے نسخوں سے بھی آزاد ہو گی۔ اب اس کے بچے بھی اس کی ضرورت اور دوسراہت یا رفاقت کے خواہاں نہیں ہوں گے۔ بلکہ وہ بھی شادیاں کر کر کے، اپنے نئے گھروں اور نئے راستوں پہ جا بسے ہوں گے۔ اپنی ذمہ داریوں کو پوری کر کے، اب وہ آزادی محسوس کرتی ہے مگر یہ آزادی موت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے کہ عورت کو ہمارے مرد کے معاشرے میں، ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا نام، خدمت اور فرض کی ادائیگی کے الفاظ میں، ادا کیا جاتا ہے اور اب آزادی اس لمحے میں ملتی ہے کہ جب نہ اس کی ضرورت ہے نہ وقعت نہ اس کیلئے حوصلہ نہ توقع۔ اُسے صرف خود کو دوسروں کیلئے مخصوص کرنے کا ہنر سکھایا گیا ہے۔ اب چونکہ اس کی ضرورت بھی نہیں۔ پھر بھی وہ جینے پہ مجبور ہے یہ کہتے ہوئے کہ میری کسی کو ضرورت

نہیں ہے۔

وہ اِس صورتِ حال سے دوچار یکدم نہیں ہوتی ہے۔ وہ اس کی بہت زیادہ توجہ حاصل کرنا چاہتی ہے جبکہ شوہر اس کی عادات جانتے ہوئے اس کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ اب وہ اپنے شوہر کے لئے بھی خود کو اضافی چیز سمجھتی ہے یا پھر شوہر اسے باور کراتا ہے کہ اس کی ضروریات بطورِ مرد جو کچھ بھی ہیں۔ خاتون بطور بیوی ان کو ادا کرنے کے قابل نہیں رہی ہے۔ دونوں میاں بیوی کا ساتھ رہنا، زندگی کی کوئی اور شکل موجود نہ ہونے کے باعث ہوتا ہے، بالکل علیحدگی اور تنہائی کی زندگی کی طرح۔ یہ دو اکیلے افراد اکٹھے بستے ہیں۔ جن عورتوں نے بڑی عمر میں جاکر بچے پیدا کئے ہو۔ ان کے لئے مصروفیت رہتی ہے۔ مگر جن عورتوں نے ۱۹، ۲۰ سال کی عمر میں بچے پیدا کئے ہوں۔ وہ تو چالیس بیالیس سال کی عمر میں دادی، نانی بن جاتی ہیں۔ یہ مرحلہ اس سے پہلے ہی آجاتا ہے کہ ماں بچوں کو اپنے سے چمٹانا چاہتی ہے اور وہ اس سے گریز کر کے، خود کو توانا محسوس کرتے ہیں۔

ماں بیٹے یا بیٹی کو اپنی پناہ گاہ سمجھتی ہے، یہ بھی بڑی دلچسپ منزل ہوتی ہے۔ عمومی طور پر سماجی اور معاشی رویوں کے باعث، بیٹے ہی کو پناہ گاہ سمجھا جاتا ہے کہ پیٹ میں رکھنے سے لے کر خود کفالت کی منزل تک وہ اس کی نگہداشت کرتی رہی ہے۔ اب اُس کے خیال میں وہ اُسے شوہر کے جبر، استحصال اور گرفت سے آزاد کر کے، عزت کا وہ منصب دے گا۔ جس کے لئے وہ کام کرتی رہی ہے۔ بچہ جو نوجوانی کی جانب مائل ہے۔ اس کو بڑی بہن کی طرح چھیڑتا، تنگ کرتا، پیار کرتا، اُس کو گود میں اُٹھا کر اپنی مردانگی کا اظہار کرتا، اس کو ڈرا کر، اپنی جرأت دکھاتا اور اس کو پیار کر کے، عافیت نامہ بناتا دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہر عورت کے ساتھ نہیں ہوتا ہے۔ بہت سی عورتیں ایسے بچوں کے بس خواب دیکھتی ہیں کہ ان کے بچے، غبی، نالائق، گستاخ اور بدتمیز نکلتے ہیں کہ بیشتر مائیں بچے کے اندر کے انسان کو عزت دینے کا نہ ہنر جانتی ہیں نہ انہیں اس کی اہمیت

کا کوئی اندازہ ہے۔ ہر عورت ہیرو اور ذہین ترین آدمی پیدا کرنا چاہتی ہے۔ مگر ہر ذہین اور ہیرو مرد کی ماں نے پہلے یہی کہا تھا کہ اُس کے بیٹے نے اس کا دل توڑ دیا ہے۔ اُس کا سکون تباہ کر دیا ہے۔ ماں کو کبھی دفعہ وہ ٹرافیاں اور انعامات بھی برے لگتے ہیں کہ جو اس کا بیٹا (بیٹی کا معاملہ بھی یہی ہے اگر وہ بھی عمومی ضابطوں سے مختلف رویہ اختیار کرتی ہے) بطور مقرر، کھلاڑی یا ذہین طالب علم کی حیثیت سے، ماں کے قدموں میں لاکر ڈھیر کر دیتا ہے کہ وہ شاید اُس کی پرورش کا یہ انداز قبول نہیں کرتی ہے۔ وہ باہر جانے لگتا ہے۔ تو کان میں کہتی ہے کہ "سردی لگ جائے گی۔ ایسے مت جاؤ" اور لڑکا مُسکرا کر اُس فقرے کو احمقانہ سمجھتے ہوئے، اُسی عالم میں باہر نکل جاتا ہے۔ وہ ذہنی طور پر اُس کے ساتھ مگر اپنے انداز میں رہنا چاہتی ہے۔ وہ اگر محاذِ جنگ پر جاتا ہے تو اس کی واپسی اور وہ بھی تمغہ یافتہ واپسی کے لئے منتظر رہتی ہے۔ وہ اس کے لئے بہتر مستقبل کی خواہاں ہے۔ مگر اُسے زیادہ کام کرتے نہیں دیکھ سکتی ہے۔ گویا جو کچھ بھی وہ کرتا ہے۔ اس پر وہ اپنے بڑے احساس اور خیال کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی کل توجہ ظاہر کرتی ہے کہ کہیں اس کی صحت خراب نہ ہو جائے، نظر خراب نہ ہو جائے وغیرہ وغیرہ، مختصر یہ کہ وہ بطور ماں۔ اولاد کے کام سے آگاہ نہیں ہوتی ہے اور اولاد، ماں کے جذبات سے نابلد۔

یہ باتیں ثابت کرتی ہیں کہ ماں اپنے بیٹے پہ فخر کرنے کے باوجود، غیر مطمئن اور ناآسودہ کیوں ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر موڑ اور ہر حال میں اس کی پناہ گاہ بننا چاہتی ہے۔ جبکہ بیٹا اپنے اعتماد کو جِلا دینے کے لئے، ماں کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔ یہ بات اور تلخ اس وقت ہوتی ہے جبکہ بہو گھر میں آجاتی ہے۔ ساس اور بہو کی چپقلش کا سبب یہی ذاتی ملکیت کا عناد ہوتا ہے۔ بیٹا تو ماں کے لئے پیدائش و پرورش کا قرض اُتارنے کا کام کر سکتا ہے۔ مگر وہ عورت تو نہیں کر سکتی کہ جو اُس گھر میں اپنی ملکیت بنانے کو آئی ہو۔ آخر کو وہ اپنے اندر کے زہر کو بہو کے کردار اور برتاؤ کے نقائص کو ظاہر کرنے پہ صرف کرتی ہے۔

بہو، اپنے شوہر کے حوالے سے تسخیرِ ذات اور تسخیر کائنات (کہ جو اس کے دائرۂ ذہن میں آتی یا آ سکتی ہو) کا تصوّر باندھتی ہے۔ وہ شوہر کو امیر بننے اور زیادہ آسودہ ماحول پیدا کرنے پہ اُکساتی ہے۔ جبکہ ماں کو ایسا عمل اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ یہ صورت مزید خراب اس وقت ہوتی ہے۔ جب بہو، حمل سے ہو جاتی ہے۔ بچوّں کی پیدائش، ماں، باپ (یعنی دادا اور دادی) کے سکون کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ اور اب ماں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹا کہ جس سے زندگی ملنے کا خواب تھا۔ وہ تو موت کا پیالہ لئے اس کی جانب رواں ہے۔ بیٹے کی اولاد کی پیدائش، ماں کے قطعی نفی ہو جانے کا بالواسطہ اعلان ہے۔

پھر بھی دادی اپنے اندر کے خدشات کو ختم کر کے، اپنے بیٹے کی پیدائشِ ثانی سمجھ کر پوتے کو گلے لگاتی ہے۔ مگر یہاں ماں، خود بچّے کی پرورش کرنی چاہتی ہے اور دادی کی دخل اندازی اور پرانے طرز کی معاشرت کو پسند نہیں کرتی ہے۔

بیٹی کی طرف ماں کا رویّہ دُہری محبت رکھتا ہے۔ بیٹے کی سمت اگر دیوتا کی طرح دیکھتی ہے تو بیٹی کی سمت وہ دیوتا اور خود اپنی ذات کا عکس بیک وقت محسوس کرتی ہے۔ یہ دُہری محبت کبھی کبھی لڑکیوں کو اپنی ماں کے سخت رویّے کے باعث اس سے نفرت کرنے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ جو مائیں خود مجبوبانہ رویّوں میں گرفتار رہتی ہیں۔ وہ اگر سوشل پارٹی میں جاتی ہیں تو بیٹیوں کو ساتھ لے جانے سے گریز کرتی ہیں۔ اگر لوگ گھر پہ آئیں تو ان کے سامنے بیٹیوں کو نہیں آنے دیتی ہیں، بلکہ بیٹی سامنے آ جائے۔ تو اس کو بچہ بچہ کہہ کر، یہ باور کراتی ہیں کہ وہ ابھی زندگی کی دیگر دلچسپیوں میں بطور عورت حصّہ نہیں لے سکتی ہے۔ شادی کی بات ہو تو کہتی ہیں کہ ابھی اس کی عمر شادی کی نہیں ہوئی۔ اگر بیٹی خود شادی کی ضد کرے تو اس کو بُرا بھلا کہہ کر چُپ کرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ دیکھنے میں یہ بھی آیا ہے کہ ایسی حکمران اور جابر ماؤں کی بیٹیاں، گھر کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نہ اُٹھاتی ہیں نہ نبھا سکتی ہیں کہ ماں

یہاں بھی بیٹی کی خامیاں، داماد کو بتاتے ہوئے، اپنی بڑائی محسوس کرتی ہے۔

مقصد یہ کہ اس نفسیات کی عورت، گویا لڑکی کی جگہ خود کو دیکھنے اور خود ہی نوجوان بننے کی متمنی ہوتی ہے۔ داماد کی تلاش کے وقت بھی وہ لڑکی کی بجائے، خود اپنی پسند کو ترجیح دیتی ہے اور رشتہ ایسا تلاش کرتی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ دولت، شہرت یا سماجی مقام کہ جس کی حسرت میں وہ زندہ تھی۔ وہ لڑکی کے رشتے کے حوالے سے حاصل کر لیتی ہے، یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ لڑکی کا ملنے والا آیا اور ماں نے اچک لیا۔ اس کا ردِ عمل یوں بھی ہوتا ہے کہ ماں کا ملنے والا آیا اور لڑکی اس کے ساتھ پھنس گئی۔ یہ الگ بات کہ عمر کا تضاد بعد میں رنگ دکھاتا ہے، مگر اس تضاد کے کھلنے سے پہلے، گھر کا شیرازہ بکھر چکا ہوتا ہے۔

نواسے نواسیوں کے ساتھ محبت یا تعلق بھی، بیٹی کے ساتھ رشتے کے مطابق ہی متعین ہوتا ہے۔ اگر تعلق، بر بنائے مخاصمت ہو تو یہی رویہ نواسے نواسیوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ لڑکی کا حمل ضائع کروانا۔ اس لئے کم ہوتا ہے کہ لڑکی چھوٹی ہے۔ اس پر اتنی جلدی بوجھ نہیں پڑنا چاہیئے، بلکہ اس لئے کہ وہ بھی ماں کے درجے پہ پہنچ کر، وہ منزلت حاصل نہ کر لے جو اُسے حاصل ہے۔ اسی طرح بچے کو دودھ نہ پلانے۔ ہوسٹل میں داخل کرانے کا مشورہ دینے کا عمل، ایسی ہی کیفیات کی توسیعی شکل ہوتی ہے۔ اگر بچہ خدانخواستہ پیدا ہو ہی جائے تو نانی ماں، بچے کو پیار کرنے کی بجائے، بچے کو ڈانٹ ڈپٹ اس قدر کرتی ہیں کہ بچہ نانی گھر سے ہی بیزار ہو جاتا ہے۔

اس کے متضاد، لڑکی کے ساتھ اپنے آپ کو منطبق کرنے والی خاتون نواسے نواسیوں سے بہت خوش ہوتی ہے۔ وہ جب اپنی بیٹی کے حمل کا سنتی ہے تو خود بیس بائیس برس پہلے کے اپنے حمل اور اپنی کیفیات کو ذہن میں لا کر خوش ہوتی ہے اور گود میں بچے کو لینے کا تصور کر کے، بڑی لذت محسوس کرتی ہے۔ اب وہ تمام خواہشیں کہ جو حیض بند ہونے سے سرد ہو گئی تھیں، پھر سر اُٹھاتی ہیں۔ وہ خود کو ہی بیٹی کی

کی جگہ حاملہ محسوس کرتی ہے، اور بچے کو قطعی طور پر اپنے چارج میں لینے کو تیار ہوتی ہے۔
یہاں بیٹی اور ماں کا اختلاف شروع ہوتا ہے کہ ماں کو بیٹی صرف مدد کرنے اور بوقتِ ضرورت
بچہ سنبھالنے کی اجازت دیتی ہے۔ جبکہ ماں یہی اختیار بیٹی کو دینے پہ آمادہ نظر آتی ہے۔
ایک اور اختلاف سر اُٹھاتا ہے اور وہ ہے دادی کا بچے پہ اختیار جتانے اور ایسی ہی نفسیاتی
کشش محسوس کرنے کا جیسی کہ نانی محسوس کرتی ہے۔ بہرحال ان شدید محرکات کو ایک
طرف رکھتے ہوئے، اگر نانی اور دادی میانہ روی اختیار کریں تو بیٹی اور بچے، ان کو
بے پناہ پیار دے سکتے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عورت کا کوئی بچہ نہ ہو یا پھر وہ بچوں کے آگے خاندان بننے اور دیکھنے
میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی ہے۔ البتہ وہ اپنے سے چھوٹے لوگوں کو مادرانہ شفقت دیتی
ہے وہ دراصل محض مصنوعی ردِ عمل کا مظاہرہ کر رہی ہوتی ہے کہ وہ ہر نوجوان آدمی کو محض
ایک بیٹے کی طرح نہ دیکھ سکتی ہے۔ نہ پیار کر سکتی ہے۔ یہ خواتین، دراصل بنتے اور مکمل ہوتے
آدمی میں اپنی محبت اور شفقت کا آمیزہ شامل کر کے، یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ اس کو جوان
کرنے اور مکمل آدمی بنانے میں ان کا بھی عمل دخل ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ مادرانہ شفقت والی
عورتیں، کسی لڑکی کو متبنیٰ بنا لیتی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ جنسی تعلق قائم کر کے اس کے اور بھی قریب
محسوس کرتی ہیں۔

اداکارہ، رقاصہ، گلوکارہ، عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ، اُستاد بن جاتی ہیں۔ وہ اب اپنی
روحانی اولاد کی پرورش کرتی ہیں۔ کسی مرتبے کی خاتون تو میڈم کہلائی جاتی ہے۔ مگر اس اولاد
کے رشتے میں بھی وہی قباحتیں سر اُٹھا سکتی ہیں کہ جو حقیقی ماں اور حقیقی اولاد کے رشتے میں بیان
کی گئی ہیں۔

یہاں اُن ادھیڑ عمر خواتین کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جو بے اولاد ہوتی ہیں جوانی کے
دن تو جوں توں کر کے گزار لیتی ہیں۔ البتہ بڑھاپا، روگ بن کر جان کو آتا ہے۔ یہ مسئلہ تو

بچوں والی ماں کے لئے بھی ہوتا ہے کہ میاں زندگی اور اپنے معاش کے پیشے میں ہمہ رنگ کے ساتھ زندہ و خوش، بچے اپنی نئی دلچسپیوں کے ساتھ، عورت کیا کرے، کشیدہ کاری، باغبانی، خیراتی اداروں میں کام۔ عورت گویا اپنے ماضی کو نبتی کاڑھتی اور مینٹ کرتی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت جب یہ کام کرتی ہے تو ہنر سیکھنے کا تصور اس کے ذہن میں نہیں ہوتا ہے بلکہ وقت کاٹنے کا خیال، ان مصروفیتوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ بیکاری اور وقت کے نہ گزرنے کا احساس اتنا بور کرتا ہے کہ عورت اگر کتاب بھی لے کر بیٹھتی ہے تو اٹھا کر کتاب پھینک دیتی ہے کہ اس میں مستقبل کی خواہنائی نہیں ہے۔ پھر وہ پیانو، مشین یا ریڈیو کھول کر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر گھبرا کر بند کر کے۔ آبا سیاں لیتی اٹھ کر ٹیلیفون کرنا شروع کر دیتی ہے۔

اب وہ سماجی زندگی میں دلچسپی لے کر، اپنے وجود کو محسوس کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی دوستوں سے ملنے جاتی ہے۔ کافی پارٹیاں کرتی ہے۔ ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے دوران ایک آدھ گھر ہو آتی ہے۔ ہر شادی، منگنی اور تقریب میں شرکت کرتی ہے اور اکیلے رہنے میں پریشانی اور کسی کے ساتھ ہونے میں لطف محسوس کرتی ہے۔ پارٹی میں شامل ہو کر وہ لوگوں کے سلوک، برتاؤ اور کردار پر تبصرہ کرتی ہے۔ راہ چلتے لوگوں کو نصیحت کرتی ہے اور تنقید کرتی، وقت گزارتی ہے۔ اگر پیسے پاس ہوں تو کوئی کاروبار کرنے کا بھی سوچتی ہے اور چاہے نقصان بعد میں ہو، ایڈونچر کرنے سے گریز نہیں کرتی کہ زندگی میں حرکت اور لطف اسی طرح محسوس کرنا چاہتی ہے۔

عورتوں کے کلب اور مینا بازار، ایسے ہی وقت کاٹنے کے مراکز ہوتے ہیں کہ جن کے حوالے سے عورتیں، سماجی زندگی میں دخیل ہوتی ہیں۔ عورتوں کے حقوق اور آزادی کے لئے قائم انجمنوں میں یہ عورتیں اپنا فالتو وقت دیتی ہیں اور تجربے نے ثابت کیا ہے کہ چونکہ ان کو مستقبل یا کسی سیاست کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے اپنی دھن میں مگن، یہ رہتی بھی

بہت کامیاب ہیں۔

عمر کے مزید ڈھلنے کی منزل، عورت کو مزید آزادی اور افسردگی کی جانب لے جاتی ہے کہ اس کا شوہر جو کہ عمر میں اس سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کے ہی سامنے اور اس سے پہلے موت کے سفر کی جانب رواں ہوتا ہے۔ اگر وہ پہلے مرجاتا ہے تو یہ اس کے لئے طمانیت کا لمحہ ہوتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر بیوی مرجائے تو مرد زیادہ پریشان اور بے چین ہوتا ہے کہ زندگی کی ہمواری کی سطح ٹوٹ جاتی ہے۔ نوکری سے ریٹائرمنٹ کے بعد شوہر بے کار زندگی گزار رہا ہوتا ہے، جبکہ عورت گھر کی پریشانی اور مصروفیت میں گزشتہ کی طرح مصروف رہتی ہے۔ جبکہ میاں صرف شور مچاتا اور گھر میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔

بزرگ عورتیں اپنی آزادی اور تنہائی پہ فخر کرتی ہیں۔ اب وہ دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ اب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ساری عمر اُن کے ساتھ دھوکا کیا گیا اور انہیں بے خبر رکھا گیا۔ اسی لمحۂ اختیار میں، اپنی گزشتہ بے اختیاری کا بدلہ لینے کے خیال ہی سے وہ بہت حد تک پاگل پن کی حد تک خود کو منوانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مرد اور عورت، اس کے لئے کوئی معمہ نہیں کہ اُس نے تمام مردوں اور تمام عورتوں کے رویّوں کو اپنے سامنے بے نقاب ہوتے دیکھا ہے۔ مثبت یا منفی، مگر ہوتا یہ ہے کہ بوڑھی عورت کی ذہنی کیفیت اور برتاؤ زیادہ تر غیر صحت مند ہوتا ہے۔ وجہ بالکل فطری ہے کہ زندگی کی کسی منزل میں وہ خود اختیار اور فعال حیثیت کی مالک نہیں رہی ہوتی ہے۔

عورت کا مقام اور کردار

اَب ہم بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عورت کے بارے میں تعصبات کی کیا وجوہات ہیں کہ یونانیوں کے زمانے سے لے کر اب تک عورت کو طعن و تشنیع کے القابات ہی سے نوازا گیا۔ اُس کی حالت، ظاہری اور مصنوعی تبدیلیوں کے باوجود، بالکل یکساں اور غیر متبدل رہی ہے۔ یہی احوال، عورت کے کردار کا تعین کرتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جاہل، ناواقف، بے خبر، ناآشنا، دھوکے باز، بے وفا، خود غرض اور بے صبر ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس پورے اندازے میں صحت اور اثبات کا پہلو بھی نکلتا ہو۔ مگر دیکھنا پڑے گا کہ عورت کے اِس کردار کے بنانے میں۔ اس کے ساختیاتی پہلو کا کم اور حالات کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں عورت کے حالات اور واقعاتی عوامل کا بھرپور جائزہ لینا ہوگا۔ ہر چندیوں کچھ باتیں مکرر کہنی پڑیں گی۔ مگر عورت کے کردار کو معاشی، سماجی اور تاریخی صورتِ حال سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

کبھی کبھی عورت کی دنیا، مرد کی دنیا سے متضاد متصوّر کی جاتی ہے۔ مگر ہم اس بات

پر اصرار کریں گے کہ عورت نے اپنے آپ میں متکفل الگ سوسائٹی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ وہ تو پورے معاشرے کا ایک حصہ ہے کہ جس میں کہ حکمرانی کا شرف مرد کو اور حکم برآری کی خدمت، عورت کا مقدر ہے۔ اس کے علاوہ نہ انہیں چین ملتا ہے، نہ عزت کہ زندگی استعاروں کا کھیل نہیں بلکہ واقعات کی کڑیوں کو آپس میں جوڑنے کا دوسرا نام ہے۔

زمانے کی تبدیلی کے باوجود، عورت اب بھی مرد کی برتری کو محسوس کرتی ہے۔ چاہے دل سے تسلیم نہ کرتی ہو۔ چاہے وہ اُس تاریخ میں خود کو قصوروار اور ذمّہ دار نہ سمجھتی ہو۔ وہ اپنے گھر کی سلطنت میں، مرد کی عائد کردہ قیود میں پابندی ہی کو زندگی سمجھنے پہ مجبور ہے۔ جیسا کہ کالے غلام اور جاگیر کے ملازم، قوانین کے پابند ہوتے ہیں۔ اسی طرح عورت پہ عائد کردہ پابندیاں اور ان کی تسلیمات، عورت کی زندگی کی اساس بنتی ہیں۔ ویسے تو تاریخی تسلسل کے باعث، بڑی انقلابی خاتون بھی مرد کا بڑا زبردست احترام کرتی اور اپنے غیر محسوس لمحوں میں مجازی خدا سمجھتی ہی نظر آتی ہے۔ مگر عمومی طور پر عورت اس امر سے آگاہ نہیں ہوتی ہے کہ وہ مرد کی حاکمیت کا جوا سر سے کس طرح اُتار کر پھینک سکتی ہے کہ زندگی اپنے گفتہ ناگفتہ قوانین کے تابع رواں رہتی ہے۔ جیسا کہ ماں کے پیٹ میں پرورش پانے اور خون کی پھٹکی سے بشر بننے والے کا محاکاتی تجزیہ کوئی ماہرِ ریاضیات نہیں کرسکتا ہے۔ اسی طرح بن کہے۔ باورچی خانے کا ہر گزرتا دن عورت میں صبر کا مادہ پرورش کرتا رہتا ہے۔ پیاز بھونا، بھننے تک کھڑے چمچہ ہلانا، آٹا گوندھنا، روٹی پکانا، گھنٹوں بیٹھے سبزی بنانا، یہ ساری باتیں حوصلے صبر اور تحمل کی آزمائش ہوتی ہیں اور آخر بوریت اور یکسانیت کا زمانہ، اُکتاہٹ میں بدل جاتا ہے۔ ذہنوں پہ پڑتی گرد، خود رو پودوں کی طرح سر اُٹھاتی ہے۔ عورت کا کام میں اور یکساں کام میں جُتے رہنا اس لئے بھی ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں وقت کسی قسم کا تخلیقی بہاؤ نہیں رکھتا ہے۔ بلکہ ایک ہی عمل کو

بار بار دُھرانا ہی مقصدِ حیات معلوم ہوتا ہے۔ اِسی روزمرّہ میں گھر کا کام بھی آتا ہے، زچگی اور حمل بھی اور گھر والوں کا پیار اور غصہ بھی، گھر کے فرنیچر کے ساتھ ساتھ، عورت کے چہرے کی جلد پھٹتی اور خستہ ہوتی جاتی ہے۔ وہ مرد کے سے رویّے سے بالکل لاعلم ہوتی ہے اور مرد کے لئے عورت کی ہر بات منطق سے خالی اور جہالت سے بھرپور ہوتی ہے۔ ایسے ہی ردِ عمل کو دیکھ کر وہ اور سکڑتی اور اپنے شیل میں معکوس ہوتی جاتی ہے۔ اُلجھنیں اُس کے اُوپر اتنی حاوی آتی ہیں کہ اُسے نہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی کوئی رائے ہے۔ اگر ہے تو اس کی کوئی وقعت ہے کہ نہیں۔

ویسے بھی مرد کی فوقیت تسلیم کرنے کے ہنر سیکھتے وہ جوان اور شادی شدہ ہوتی ہے۔ اس لئے تنقید، تبصرہ، جائزہ، اندازہ، ایسے سارے کام وہ مرد کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔ گویا آدمی اپنے بُت بناتا ہے اور عورت اُن کی پرستش کرتی ہے۔ آدمی، عورت کی طرح، خود ساختہ بتوں کے سامنے اس طرح نہیں جُھک سکتا اور پرستش کر سکتا۔ جیسی کہ عورت کرتی ہے[لے] ہر اولمپس میں ایک عظیم ترین دیوتا اور پھر دوسرے درجوں کے دیوتا ہوتے ہیں جو کہ سب کے سب مردانہ صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ معاشرے نے تو خدا کے تصور کو بھی مردکی ذات و صفات سے منسلک کر دیا ہے۔ بُت پرستی کا سلسلہ جدید زمانے میں ہیرو ورشپ میں ڈھل گیا ہے۔ ٹیٹو یا ڈیگال اپنے مردانہ حسن اور وجاہت کے باعث عورتوں میں بے حد مقبول تھے اور ان ہی کی حمایت پہ حاکمیت حاصل کر سکے تھے۔ عورت چونکہ تاریخی

لے حوالہ سارتر کا ڈرامہ "Les maims Sales" "ہیوڈُرر انہیں تو اعتقاد کے لئے کچھ چاہیئے۔ تم جانو۔ ان کو بنے بنائے خیالات دیئے جاتے ہیں اور پھر وہ ان خیالات پہ خدا کی طرح اعتقاد کرتی ہیں۔ ہم ہی تو یہ خیالات بناتے ہیں اور جانتے کہ یہ خود ساختہ ہیں۔ ہم ان کی قطعیت سے اسی لئے منکر ہوتے ہیں۔

طور پر بھی مرد کے توسط سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ اس لئے موجود عورت بھی خود کو وقت کے دھارے کے حوالے کر کے، سماجیات کی منطق لاکر، مرد کی برتری کے نظام کو قائم رکھنے ہی میں عافیت سمجھتی ہے، اس کا ایمان تو مرد ہوتا ہے۔ چونکہ مرد نے کہا ہے کہ قانون کا احترام کرو۔ اس لئے وہ قانون کا احترام کرتی ہے۔ بڑی بڑی جنگوں میں آپ نے دیکھا اور تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ عورتیں گرفتار کر کے فرمانروائے وقت کی خدمت میں پیش کی جاتی تھیں کہ حضور جس کو اور جیسا پسند فرمائیں۔ باقی حق غلاموں کا، پومپیائی شہر کی کھدائی میں جو سنگ تراشی کے نمونے برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں مرد، شجاعت کا ہنر دکھاتے سینہ پھلائے، جنگ آزما نظر آتے ہیں، جبکہ عورتیں، عجز سے جھکی ہوئی مؤدب اور آنکھیں نیچے کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔

صبر کی تعریف، عورت کے لئے بیان کی جاتی ہے کہ وہ مرد سے زیادہ تکلیف اور درد برداشت کر سکتی ہے اور برداشت کرتے ہوئے، مرد کی طرح نہ مظاہرہ مردانگی کرتی ہے۔ نہ احساس تفاخر کا تماشہ بناتی ہے۔ بلکہ اکثر مصالحت کو کارفرما رکھتے ہوئے پیش رفت کی کوشش کرتی ہیں۔

انیسویں صدی میں عورتوں کی بزدلی نے مزدوروں کی جدوجہد کو کافی نقصان پہنچایا کہ انقلابی مزدوروں کے آگے بڑھنے اور گرفتاریاں پیش کرنے میں آڑے ان کی بیویاں ہی آئیں کہ وہ بے کاری، ہڑتالوں اور غربت سے خوفزدہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ انقلاب کے نام پر شاید غلطی ہی کی جا رہی ہو کہ ان کے اندازے کے مطابق گھر کی موجود کمی؟ انقلاب کے نام پر گلیوں میں خوار ہونے کے مقابلے میں بہرحال خوشگوار تھی۔ اس کا سبب بنیادی یہ ہے کہ عورت نے نہ خود آزاد ہونا سیکھا ہے، نہ آزاد ہونے کی جدوجہد میں شریک ہونا۔ اسی لئے مرد کو اس راہ پہ چلنے سے روکنے والی بھی وہی بنتی ہے۔ ذرا مستقبل کی درخشانی اس پر واضح ہو۔ پھر دیکھئے کہ وہ ماضی سے کس طرح دست کش ہوتی ہے۔ جب عورتیں عملی زندگی میں واقعی

آتی ہیں تو پھر کس ہمت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ تاریخ میں وہ بھی ملتا ہے[1]۔

خواتین کی بے شمار خامیاں، ان کی محدودیت کے باعث ہوتی ہیں۔ وہ ذہنی بالیدگی کے باوجود، ذہن استعمال نہیں کرتیں کہ مواقع نہیں ملتے۔ حرم میں کنیز کو گلاب کے عرق کی خوشبو کی لذت و نزاکت کا احساس ہوتا ہے، مگر وقت گزارنے کے لئے وہ اس احساس کو زندگی سے خارج کر دیتی ہے۔ جب عورت، متوسط طبقے کے گھر میں ہو یا پھر قحبہ خانے میں۔ وہ اپنی یکسانیت کو توڑنے کے لئے آرام دہ ماحول اور سکون کی خواہش لئے کھڑکی سے باہر جھانک سکتی ہے۔ اگر وہ جنسی لذت کے لئے بے چین دکھائی دیتی ہے تو اس کا سبب لذتِ جنس کی وہ خواہش ہو سکتی ہے جو اُسے اَب تک حاصل نہیں رہی۔ کوئی جنس سے بیزار ہو کر، آرام، عیش اور پُرتکلف زندگی کی راحت کو اپنا سب کچھ مان سکتی ہے۔ ان تمام صورتوں کے مقابلے میں مرد کے ہم پلہ کام کرنے والی عورت، مرد کی طرح چاق وچوبند اور مستعد ہونے کے علاوہ، جنس اور لذت قسم کے عوامل سے دور رہتی ہے۔

معاشی صورتِ حال نے عورت کو غلام بنانے اور رکھنے میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ جس عورت کی روزی اور مستقبل کا کُل دارومدار، مرد کی کمائی اور آمدنی پر ہو۔ وہ اس کی جرابیں اُتارنے سے لے کر، گھر کا بہترین کھانا، مرد کے لئے اُٹھا کر رکھنے میں حق بجانب ہوگی۔ غلام تو اپنی چمڑی دے کر بھی اپنی غلامی برقرار رکھتا ہے اور ایسی زندگی کو برحق سمجھتا ہے۔ نیکن اور برتن دھو کر، گھر میں روٹی حاصل کرنے والی عورت بھی تو غلامی کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ اب جو کچھ بھی مرد کہتا ہے " تو بے وقوف ہے۔ نا سمجھ ہے۔ نہیں جانتی کہ معاشرہ کیا ہوتا ہے۔ مرد کیا ہوتا ہے اور کیا کرتا ہے" اور وہ واقعی ویسا ہی جانتی ہے

---

[1] سیمون کے بقول شمالی فرانس میں کانوں کی ہڑتال کے دنوں میں عورتوں نے جس تحمل اور عزم کا مظاہرہ کیا وہ فقید المثال تھا۔

جیسا اس کا شوہر اس کو سمجھاتا ہے۔ وہ وہی کچھ کرتی ہے۔ جو کچھ اس کا شوہر اس سے توقع کرتا ہے۔ چوپائے کی زندگی اور گھریلو عورت میں فرق یہ ہوتا ہے کہ اُسے پکا پکایا مل جاتا ہے جبکہ عورت کو پکا کر بچا کچا مل جاتا ہے اور کبھی اولاد یا شوہر نے یہ خیال نہیں کیا کہ بطور انسان یا فرد، عورت کو بھی جینے کا حق حاصل ہے۔ بہت سے شوہر تو گھر میں سبزی گوشت دے کر، باہر سے تالا لگا کر دفتر جاتے ہیں اور واپس تالا کھول کر، گھر میں داخل ہو کر، پہلے یہ چیک کرتے ہیں کہ کہیں کوئی کھڑکی تو نہیں کھلی ہے، پھر کھانا کھاتے ہیں۔ کچھ جھت پر بنے غسل خانے میں بیوی کو اکیلے نہیں جانے دیتے ہیں۔ بلکہ ساتھ جاتے ہیں۔ اس کے لئے وہ سب سچ اور حقیقت ہے جو اس کا شوہر کہے، بتائے اور باور کرائے۔ وہ ذرا سی بات سنتی ہے تو مارے خوشی اور گھبراہٹ کے سارے زمانے میں افواہ کی طرح پھیلا کر ذہنی سکون حاصل کرتی ہے کہ اس نے معاشرے میں باورچی خانے کے کام کے علاوہ بھی کوئی کردار ادا کیا ہے۔ اس کے لئے تو ریل کا حادثہ، کسی بزنس کا فیل ہو جانا۔ ہوائی جہاز کا گر جانا، سب کچھ، گھر میں ترتیب میں فرق آجانے کے برابر ہی معلوم ہوتا ہے۔ ہاں اگر یہ صورتِ حال اور گھر میں اس کی بے بضاعتی، اس کی ہی سمجھ میں آجائے تو پھر گھر میں بے سکونی اور صورتِ حال کی تبدیلی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اب عورت مل کر بیٹھتی ہے تو مرد، معاشرے اور قسمت کا گلہ کرتی ہوئی اپنی کم ہمتی پر لعنت بھیجتی ہوئی، کچھ کر گزرنے کے وفور میں خود کو جذب کرتی ہے۔

ایک آزاد فرد، اپنی ناکامی کا برملا اعتراف کرتا اور اس کے ذمہ دار افراد یا فرد کی نشاندہی کرتا ہے، البتہ عورت اپنے عدو، مرد کی نشاندہی تو کر لیتی ہے۔ مگر شکایات کے طومار کے سامنے، منطق کی کسی لہر کو ٹھہرنے نہیں دیتی ہے اور اُسی صورت میں سہنے کو بھی وفا شعاری سمجھتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ موجود سے گریز اُسے مزید گمشدگیوں میں ڈال سکتا ہے۔ ساتھ ہی اُسے خیال آتا ہے کہ بچپن سے اس کو خوابوں کے شہزادے کا

کا فریب دیا جاتا ہے جو گھوڑے پر سوار ہو کر آتا ہے اور اُسے زندگی کی ساری محرومیوں سے نجات دلاتا ہے، ساری پیاسیں بجھاتا ہے۔ سارے ارمان پورے کرتا ہے۔ مگر زندگی متضاد رویوں کو سامنے لاتی ہے، تو وہ ساری مرد برادری سے خائف ہو کر، خود اذیتی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

مگر پھر اس اذیت کے باوجود، سر کے اوپر چھت اور تحفظ کی ساری تہیں وہ مرد کی چھاؤں ہی میں تلاش کرتی نظر آتی ہے۔ جو شخص عمل کرتا ہے۔ اس کے ہاتھوں ہی میں معاشرتاً نیکی اور بدی کی باگیں ہوتی ہیں۔ وہ بر خود یہ سمجھتا ہے کہ اُسے ہی چیزوں کی تعریف کرنے اور ان کا دائرۂ اثر متعین کرنے کا حق حاصل ہے۔ مرد، عورت کے لئے اچھائی اور برائی کی سطحیں مرتب کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے عورت بچے کے لئے یہ سطحیں مرتب کرتی ہے۔ عورت کے خیال میں یہ غلطی اور ناانصافی حکومتی سطح کی مشینری کے ہم خیال ہونے کی ہے، ورنہ جیسے گھر صاف ہو جاتا ہے کہ جب سارا گند اٹھا کر باہر پھینک دو، تو کیا اسی طرح نظامِ معاشرت درست نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ فریضے اور منصوبے تو مستقبل کے نا اعتبار ہونے کے باعث، پنپ سکتے ہیں۔ حقیقتِ احوال یہ ہے کہ جس کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہو یا جس کو احساس ہو کہ ناانصافی ہو رہی ہے، وہ اس کے ذمہ دار افراد کی نشاندہی کرتا ہے۔ عورت چونکہ محدود دائرۂ اختیار میں رہتی ہے۔ اس لئے اس کو اعتبار ہوتا ہے کہ شوہر، اُس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا باعث اور منبع ہے۔ مرد چاہے اس کے ساتھ بہت ہی توجہ اور حسنِ سلوک کے ساتھ رہ رہا ہو۔ وہ پھر بھی سوچے گی کہ جہاں کہیں لمحہٗ زیادتی یا بد سلوکی ہے۔ اس میں اس کا کوئی دخل نہیں۔ مرد کی نیت اور فطرت ہی ایسی ہے۔ مرد اگر کسی عورت سے نفرت کرتا ہے تو اُس سے جان چھڑا لیتا ہے۔ مگر عورت تو اس مرد سے جان بھی نہیں چھڑاتی بلکہ مسلسل طعنوں سے اس کو چھلنی کرتی رہتی ہے۔ بیوی کا منتہائے مقصود، خود کو شہید اور مظلوم ثابت کرنا ہوتا ہے

یہی وجہ ہے کہ آنسو بہا کر، مقصد حاصل کرنے کی کہانی، محض من گھڑت بات نہیں ہے۔

آنسو بہنے اور یوں رو پڑنے کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں اپنی غیر ضروری اور غیر اہم حیثیت سے بغاوت کو جی چاہے تو ردِ عمل کی تربیت نہ ہو سکنے کے باعث وہ کیا کرے۔ یہ بھی درست ہے کہ اعصابی طور پر وہ مرد سے کمزور تر نہیں ہوتی ہے مگر اس کی تعلیم و تربیت بھی اپنی بے بسی پہ آنسو بہانے کے علاوہ کسی اور طرح نہیں ہوتی ہے۔ مرد بھی روتے تھے۔ مگر جب یہ بات فیشن کے خلاف قرار پائی تو انہوں نے رونا دھونا بند کر دیا۔ البتہ عورت فوری طور پر زمانے، مرد اور معاشرے سے بے توجہی کا گلہ کرنے بیٹھ سکتی ہے۔ وہ ہر وقت زمانے سے گلہ اس لئے بھی کرتی ہے کہ اس نے واضح طور پر دنیا کو قبول نہیں کیا ہوتا ہے، ایک مرد، دنیا کو قبول کرتا ہے تو بد قسمتی بھی اس کی اِس قبولیت میں فرق نہیں ڈال سکتی ہے۔ جبکہ عورت ذرا سی تلخی پہ زمانے کی گلہ گزار ہو جاتی ہے، پھر وہ اپنے قابلِ اعتبار پڑاؤ کی جانب ملتفت ہوتی ہے اور یہ ہوتے ہیں۔ اس کے آنسو، جلتے سرخ رخساروں سے وہ اپنی مظلومیت کی دہکتی آگ کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ مرد، منع کرتا ہے اور عورت رونے پہ انحصار کرتی ہے کہ دونوں نے اپنے عمل کے میدان، اسی طرح وضع کئے ہیں اور پھر مرد کے دل میں بھی عورت کی ہچکیوں سے جو ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ وہ بھی تو قابلِ ذکر اور معنی خیز ہوتی ہے۔

جب عورت کے آنسو ناکافی ہتھیار ثابت ہوتے ہیں۔ تو پھر عورت چیخ و پکار اور اپنے کپڑے پھاڑنے پر اتر آتی ہے۔ حتیٰ کہ مرد کو یہ حالت دیکھ کر، عورت کو تھپڑ رسید کرنا ہی پڑتا ہے۔ مرد عموماً اس لمحاتی ردِ عمل سے گریز کرتا ہے کہ عورت اسی وقت مرد پہ خود کو پھینک کر، اپنا منہ نوچنا شروع کر دیتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عورت بتانا چاہتی ہے کہ وہ محکومی جو گھر میں اس پر وارد کی جا رہی ہے۔ وہ اس کو برداشت کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔ اگر اعصابی تناؤ سے اُس کے ہاتھ پیر مڑ جائیں تو یہ بھی اس کیلئے ناقابلِ برداشت

صورتِ حال کی منہ بولتی تصویر ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چاہے کچھ حالت ہو، ماں پلنے بوٹے بچوں کے ساتھ اس صورتِ حال کا مظاہرہ کبھی نہیں کرے گی۔ ہاتھ پیروں کا اکڑنا دراصل اپنے اندر کی طاقت کو باہر نکلنے سے باز رکھنے کی کوشش ہوتی ہے اور صورتحال کی تلخی کے منفی اثرات کو ظاہر کرنے کا ایک ناقابلِ گرفت طریقہ، وہی ماں جو اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ اس صورتحال کا اظہار نہیں کرتی ہے۔ وہی ماں جب اپنے جوان بچے کے برتاؤ کو دیکھ کر برہم ہوتی ہے یا اپنے شوہر یا اپنے محبوب کا ناقابلِ اعتبار برتاؤ دیکھتی ہے تو پھر ایسے ردِّ عمل کا اظہار کرتی ہے۔ میڈم ٹالسٹائی کے ہسٹیرک سین قابلِ ذکر ہیں۔ ہر چند اس خاتون کی غلطی یہ بھی کہ اس نے کبھی اپنے شوہر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اس کی اپنی ڈائری پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سلسلے میں بے حد تنگدل، غیر جذباتی اور بے مہر تھی۔ میڈم ٹالسٹائی ذہنی طور پر جو کچھ بھی تھی۔ بہرحال اُسے ساری عمر تنہائی کے آتشکدے میں زچگیاں اور زندگی کی ساری صعوبتیں کاٹنی پڑیں۔ اس کے لئے اپنے وجود اور حالات سے سمجھوتہ نہ کرنے کے لئے سوائے پاگل پنے کی چیخوں کے اور کچھ بچا بھی نہیں تھا۔

عورت کی جارحیت کی انتہا کی ایک اور شکل بھی ہے اور اس کا نام، خود کشی ہے۔ مگر دیکھا یہ ہے کہ خودکشی، عورت کم اور مرد زیادہ کرتے ہیں۔ ویسے اعداد و شمار؛ بہت خلط ملط ہیں۔ ناکام خودکشیاں عورتوں میں اور کامیاب خودکشی کی کوشش مردوں میں ملنے کے اعداد و شمار دستیاب ہیں۔ یہ شاید اس باعث بھی ہو کہ عورت خود استحصالی اور خود انحطاطی، ظاہر تو کرتی ہے۔ دراصل اس طرح چاہتی نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ خودکشی میں وہی پرانے وحشیانہ رویے اختیار کئے جاتے ہیں۔ عورت کبھی چاقو، پستول یا گنڈاسے کا استعمال نہیں کرتی، اسی لئے جب اپنی جان ختم کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے، تو ناتجربہ کاری کے باعث، ناکام خودکشی پہ منتج ہوتی ہے۔ پھر وہ چھت سے چھلانگ لگانے، پانی میں غرق ہو جانے پہ، زندگی کی بازی ہار دینی چاہتی ہے۔ عورت نہ

چاہتے ہوئے بھی، اس مرد کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جو اس کے دشمن کی طرح ہے، وہ ظاہر یہ کرتی ہے کہ اس سے ناطہ توڑنا چاہتی ہے، مگر بہت کم کامیاب کوشش کر سکتی ہے کہ اس کے اندر فیصلہ کرنے اور یہ خاص فیصلہ کریں اس مرد سے ناطہ ختم کر سکتی ہوں یہ قوت بالکل نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ سے، زندگی اور مرد سے گلہ مند رہتی ہے۔ مگر اس صورتِ حال سے خود کو نکالنا نہیں چاہتی ہے۔

عورت کے ردِ عمل کے اور بہت سے عوامل ہیں کہ جنہیں احتجاج ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ عورت اپنے شوہر کو صرف اپنے آپ کو خوش کرنے اور اس سے بغاوت کا اظہار کرنے کے لئے تنگ کرتی ہے۔ اس کا کہا نہیں مانتی ہے۔ یعنی اگر وہ بہت منظم اور کفایت شعار ہے تو یہ جان بوجھ کر خرچیلی اور لاپرواہ رویہ اختیار کرے گی (یہی رویے، متضاد صورتِ حال میں نظر آئیں گے) میسوگائنسٹ ایک عورت کو ہمیشہ دیر سے پہنچنے پہ ڈانٹا کرتی تھی کہ اُسے معلوم تھا کہ اگر وہ چاہتی تو وقت پر پہنچ سکتی تھی۔ کچھ محبوبانہ خصائص کی خواتین یہ سمجھتی ہیں کہ یوں وہ مرد کی آتشِ خواہش کو بھڑکا سکتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ، اس رویے سے، دراصل عورت اپنے زندگی بھر کے انتظار کا بدلہ لے رہی ہے۔

گویا اس کا پورا وجود، انتظار کا اعلان ہے کہ اس کے ہر تقاضۂ زیست کو احکامات کے تحت گزرنا ہوتا ہے۔ وہ مرد کی رضامندی، مرد کی محبت کا انتظار، اس کی حمایت اس کی خواہش، اُس کے دیئے ہوئے پیسوں اور یوں دوکانداروں کے قرض اُتارنے کے لئے اضافی پیسوں کا مطالبہ، سب کچھ اس مرد کے حکم پر ہوتا ہے کہ جس کے انتظار میں وہ خود کو بنا سنوار کر رکھتی ہے کہ شاید نگاہِ غلط انداز ادھر بھی ہو جائے۔ وہ مرد کی زندگی کا ایک جز ہوتی ہے، جبکہ عورت کے لئے مرد "کل" کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرد، گھر سے باہر اپنی مصروفیات رکھتا ہے۔ جبکہ عورت سارا دن گھر میں، اس کی

محبت، التفات، کرم اور نگاہِ غلط انداز کی چھاؤں میں گزار دیتی ہے۔ بستر میں بھی وہ مرد کے مطالبے اور خواہش کا انتظار کرتی ہے۔ کبھی کبھی بے تحاشہ جی چاہے بھی، تب بھی اُسے مرد کے مطالبے کے انتظار میں صبر کرنا پڑتا ہے۔ گویا عورت کو قدم بقدم مرد کی رضا اور حکم برآری کی منازل طے کرنی پڑتی ہیں، اس طرح جو خواتین ذرا سا اپنا تشخص قائم کرنا چاہتی ہیں۔ وہ بس مرد سے اختلاف کرنے سے نہیں، بلکہ صرف اس کے انکار سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہیں۔ یہ انکار انتہائی درجے کا ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں عزت و نافرمانی، مساوی درجوں پر ہوتی ہے اور جو درجہ بھی سبقت لے جائے، وہی اس کی طبیعت کا مظاہرہ بن جاتا ہے۔ وہ مرد کی حاکمیت کے نظام کی سب خرابیاں جانتی ہے اور جب موقع ملتا ہے۔ تو ان سب کو برملا کہنے میں تامل بھی نہیں کرتی ہے۔

عورت کو مرد کے میدانِ عمل میں داخل ہونے کا چونکہ نہ تجربہ ہوتا ہے، نہ منطق آتی ہے اور نہ فنی آگاہی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس میں قدم آگے بڑھا بھی نہیں سکتی ہے۔ دوسری طرف مرد، عورت کے تجربات کو محض عورت سے منسوب کرکے خود کو علیحدہ کر لیتا ہے۔ انجینئر، اگر گھر پر کام کر رہا ہو تو خود کو بہت الگ اور خُدا کے برابر کی چیز سمجھ کر، دوسرے افراد سے سلوک کرتا ہے کہ اس کا کھانا بالکل بروقت اور بغیر کسی گڑبڑ کے لگے۔ اس کے کپڑے باقاعدہ استری ہوں اور اس کا سارا ساز و سامان ایسے آراستہ ہو۔ جیسے حضرت موسیٰ کے کہنے پر دریائے نیل دو حصّوں میں منقسم ہو کر ٹھہر گیا تھا۔ گویا ہر ساعت اس کے حکم پر ایستادہ ہو اور آج کی عورت یہ جانتی ہے کہ ایسے رویے عورت کو محکوم اور تابع رکھنے کے گُر کے علاوہ کوئی اور حیثیت نہیں رکھتے۔ ساتھ ہی عورت یہ بھی جانتی ہے کہ وہ اس اطاعت سے گریز کا بہت بڑا دائرہ نہیں رکھتی ہے۔ وہ بغاوت اور غلامی کے درمیانی شکل میں ٹنگی رہتی ہے۔ اس کے باوجود مرد اس کے اُدھورے

تعلق اور ادب کو اپنے پورے حکم نامے کے ماتحت رکھنا چاہتا ہے۔

مرد، بطور شہری اور ذمہ دار فرد، دوسرے مردوں کے ساتھ روابط کو موجود درجہ بندی اور قیود کی سطح پر قبول کرتا اور برتتا ہے۔ جبکہ عورت کے ساتھ روابط اُن درجہ بندی کی حدود سے ماورا کہ اس کے تعلق سے خواہش اور خوشی کا ادراک کرنا مقصود ہوتا ہے، بہت حد تک مختلف بلکہ بغیر کسی درجہ بندی کے ہوتے ہیں۔ مگر صرف اپنے ذاتی دائرے میں، اُس خاتون کے ساتھ پبلک اور ساری دنیا کے سامنے تعلقات، مرتبے کی قیود کے مطابق کبھی دکھائے، کبھی بالکل نہیں دکھائے جاتے ہیں۔ اکثر بیویاں بھی اِسی متضاد درجہ بندی کا شکار ہوتی ہیں۔ وہ عوام کے سامنے زیادہ بچے پیدا کرنے کی تقریر کرتا ہے اور گھر میں بیوی کو اور کوئی بچہ پیدا نہ کرنے کا سختی سے مشورہ دیتا ہے۔ وہ نیک اور پاکباز رہنے کی اپنی بیوی کو تلقین کرتا ہے، مگر جس عورت پہ بھی نظر پڑے، اُسے اپنے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے اور ذرا ایڈوانس ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ ادھر مرد اسمبلیوں میں قرار دادیں پاس کرواتے ہیں کہ اسقاط غیر انسانی اور غیر قانونی فعل ہے۔ اُدھر خود عورتوں، لڑکیوں اور دوستوں کو نہ چاہنے کے باوجود، ایسے کلینکوں کی سمت گھسیٹتے لے جاتے۔ اسی طرح فحاشی اور طوائفیت کے حوالے سے وہ ہروقت معاشرے میں تعفن کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان کوٹھوں پر کون جاتا ہے اور کون ہے جو رات بسر کرنے کے بعد، صبح ان کو شناخت کرنے سے گریز کرتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ دو بارہ اور تیرہ برس کی لڑکیاں گناہ کی زندگی گزارنے کے الزام میں گرفتار ہوئیں۔ جب عدالت میں انہوں نے اصل مجرموں کی نشاندہی کی تو جج نے کہا کہ تم لڑکیوں کو اپنی بدفعلی کے لئے، لائقِ احترام شخصیتوں کے نام لینے کی جرأت کیسے ہو رہی ہے۔ وہ لڑکیاں کہ جو اَب بدکردار کہلا رہی تھیں۔ ان کو بدکردار کرنے والے کون تھے؟

عورت، مرد کے اس ذو معنی اور متضاد رویے کو سمجھتی ہے۔ اسی لئے وہ اگر اسقاط

کرانے جاتی ہے۔ تو مرد کو بتائے بغیر، وہ اگر کسی کے ساتھ گھومنے جاتی ہے تو مرد کو بتائے
بغیر۔ اگر وہ بچہ دانی بند کرا لیتی ہے تو مرد بظاہر اس بات پر خوفزدہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ کسی
اور مرد کے ساتھ سونے نہ چلی جائے۔ مگر اندر ہی اندر وہ آئے دن کے اسقاط کے خرچ
اور خوف سے خود کو آزاد محسوس کرتا ہے۔ عورت چونکہ، مرد پر مکمل طور پر مالی ذمہ داری اور
بوجھ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے جیسے اور جب مرد چاہے، اس کو حکم دینے کا حق رکھتا
ہے اور عورت اس کی حیثیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ یعنی بستر میں، مرد کے حکم
پر لذت محسوس کرنا اور گھر میں حاکمیت اگر منظور نہیں تو باہر۔ ورنہ نفسیاتی دباؤ، لڑائی
مار کٹائی، دنگا فساد کے باوجود عورت کے ذاتی مفاد میں ہے کہ وہ اُسی چھت کے تلے
محفوظ محسوس کرے۔ شاید اسی لئے جب اور جہاں عورت مرد کو دھوکہ دینے میں کامیاب
ہوتی ہے۔ وہ اُسی کو اپنی بڑائی محسوس کرتی ہے۔

مرد کو دھوکہ دینے کے اس شائل کو وہ بڑائی سمجھنے لگتی ہے۔ اُسے بغیر پاس لئے
ریلوے سٹیشن کے اندر جانا ہے۔ وہ مُسکرا کر پولیس مین کو دیکھتی ہے۔ محرومیوں کا مارا پولیس مین
اسے اپنے لئے کافی سمجھتا ہے اور بے عزتی کی ماری۔ ایسی عنایت کو اپنی ذات کی اہمیت
کے لئے کافی سمجھتی ہے۔ دوکاندار بھی اس سے دو پیسے کم قیمت وصول کرے اگر کپڑا ساتھ
لگا کر دکھاتے ہوئے وہ کپڑے کو اس کے سینے پر ہاتھ لگاتے ہوئے پھیلائے اور
عورت جواباً کچھ نہ کہے۔ گویا عورت کو اپنی طاقت کا استعمال نمائش مسکراہٹ کے بہروپ
میں سکھایا جاتا ہے۔ ان ہی عوامل کے پیچ و خم اور ردِ عمل میں۔ وہ اپنی شخصیت کو کسی
جامع روپ میں محسوس نہیں کر سکتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ چیلنج کرنے کے باوجود، وہ مرد کے مقابلے میں کوئی متوازی دنیا
تخلیق نہیں کر سکتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بچے کی پیدائش کے مراحل پر گفتگو
کرتی ہیں۔ خوبصورتی بڑھانے اور قائم رکھنے کے نسخے مل کر سوچتی ہیں۔ اپنے تقدیر کے سارے

دیکھ کر موازنہ کرتی ہیں۔ مگر قابلِ ذکر معروض دنیا تخلیق کرنے کا نقشہ نہیں کھینچ سکتی ہیں۔ ہر چند، مرد میں بھی ایک بگڑا بچہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ مرد میں اُس کے عہدے، عزت، مقام اور پیشہ ورانہ مہارت کے علاوہ ایک محبت کرنے، فرد کی متلاشی ہوتی ہے۔ مجازی خدا مان لے تو وہ قطعی طور پر مرد کی جاذبیت، حاکمیت اور آمریت کو تسلیم کرنے کی خو ڈال لیتی ہے۔ ہاں اگر مرد کی دنیاوی شہرت اور عزت اُسے اپنی جانب ملتفت کرتی ہے تو پھر سپر ڈال دیتی ہے۔ یہی ذومعنویت اور اخلاقی نظریے، عورت کے اپنے کردار اور نقطۂ نظر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

عورتوں کی جسمانی ہیئت بھی ان کو پریشان کرتی ہے۔ ہر ماہ حیض کا آنا، درد اور تکلیف کے علاوہ جسمانی بے آرامی، پھر وہی بدن جس کی تعریف، مرد آئینے میں عکس دیکھ کر بھی کرتا ہے۔ وہی بدن، حمل کے دوران، خوفناک بدشکلی کا شکار ہوتا ہے۔ آزادی کا پرندہ، ماں بننے کے بعد، گلدانوں میں پھول سجانے کو گل گشتِ چمن پہ فوقیت دیتا ہے۔ یہ حصار کچھ عرصے جاری رہتا ہے اور پھر اندر کا ذہن، اپنے وجود کی گواہی چاہتا ہے۔ پھر سارے سراب فنا ہوتے ہیں۔ پھر آزادی اور آزاد رہنے کا خواب وجود میں سانس لیتا ہے۔ آنکھوں میں غصے اور ہمت کی یکجا شفق پھوٹتی ہے اور اب اُسے توازن قائم رکھنے کی مشین پہ تولا جاتا ہے کہ کیا وہ گھر اور باہر کی سرگرمیوں میں باہمی ارتباط د ترتیب رکھ سکتی ہے۔ یہاں خاتون کا اپنا نقطۂ نظر کام آتا ہے کہ وہ صورتِ حال کی کونسی شکل کو قابلِ قبول سمجھتی ہے۔ وہ اپنے گناہوں لغزشوں، شوق، تعلق اور لطف کو اپنے ذہن کے میزان میں تولتی ہے۔ جو خود اعتمادی کی دستاویز ہاتھ میں رکھتی ہیں۔ وہ تو آگے نکل جاتی ہیں۔ باقی زیادہ تر عورتیں مذہب کے آگے سر جھکا دیتی ہیں کہ اپنے تضادات کا جواب نہ پا کر۔ اس کے سامنے سر ٹیکنا کہ جو سب کے تضادات اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ دنیا کے مذاہب کی تاریخ دیکھیے تو بھی یہی اندازہ ہو گا کہ عورت کو مذہب، بیداری کی منزل سے پرے کھینچتا ہے۔ سبب

مذہب نہیں بلکہ مذہب کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ عورت صرف درونِ خانہ رہنے اور سر جھکانے کا عمل کرتی ہے۔

عورت کا ماحول، اس کی اقدار، اخلاقیات، دلچسپیاں دانشمندی اور برتاؤ کو متشکل کرتا ہے۔ یہ سارے عوامل، عورت کو اوسط درجے کے انسان کے برابر بھی شعور رکھنے اور ہمت بلند کرنے سے باز رکھتا ہے۔ ہر چند عمومی معاشرے میں مرد بھی اوسط ذہن اور شعور کے مالک ہوتے ہیں۔ مگر عورت کا اس طرح ہونا، عیب کی طرح نوٹ کیا جاتا اور اس کے کمتر شہری ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کام کرنے والی عورت ہو تو دفتر، گھر، سب جگہ، زیادہ باشعور، زیادہ بااعتماد اور ان تھک ہونے کا ثبوت دیتی نظر آئے گی۔ گھر پر ہوگی تو وہ محلے والوں اور رشتے داروں میں مگن ہوگی۔ جبکہ شوہر، افسروں کی تابعداری میں سر بہ زانو رہ کر، گھر کو لوٹے گا۔

دفتر کا ماحول، جیسا کہ کافکا نے بیان بھی کیا ہے۔ قطعی طور پر فرسودہ طور طریقوں، رویوں اور عوامل پر مشتمل ہوتا ہے۔ جبکہ گھر کی عورت بنیادی حقیقتوں کے ساتھ نبرد آزما ہوتی ہے۔ وہ بچے کو نہلاتی، گھر صاف کرتی، کپڑے دھوتی، کھانا پکاتی اور بازار سے سودا سلف لاتی ہے، جبکہ مرد، دفتری فائلوں میں اعداد و شمار کے ان چکروں میں گرفتار ہوتا ہے کہ جن کا اس کے وجدان کے اعتبار کے باوجود، حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔ پھر بھی عورت اپنے کام کو صفر کے برابر سمجھتی ہے اور سمجھایا بھی یہی جاتا ہے۔ مرد اپنی ذات کے تہور کو عظیم تر ثابت کرنے میں مگن اپنے پیشے اور اپنے فن کو معراج پہ پہنچانے کی منصوبہ بندی میں گرفتار، نرگسیت کا شکار ہوا، دندناتا پھرتا ہے۔ مگر عورت ان چیزوں سے دام نہیں ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کی آئینہ داری سے گریز نہیں کرتی ہے۔ مرد دنیا جہان کی غیر متعلق باتوں کو موضوع بنا سکتا ہے، مگر عورت اپنے تجربے اور محدود علم کے حوالے سے بات کرتی ہے۔

عورت، لطافتوں اور نزاکتوں کے ماحول میں، مرد کے پیدا کردہ اور پسندیدہ ماحول میں سانس لے تو پسند کی جاتی ہے۔ پھول، خوشبو، زیور، آرائش، زیبائش، لباس، شام کو سیر، ذرا باہر گھمانا، اگر مرد چاہے تو، عورت کی سلطنت کے اجزا، اور اگر مرد ناپسند کرے تو ہنستی کھیلتی عورت، مرد کو دیکھتے ہی خاموش ہو جاتی ہے۔

عورت اپنی تنہائی اور تنہا رہ جانے کے عوامل سے اپنی ذات کا وجدان حاصل کرتی ہے۔ وہ اپنے دل، دماغ اور بدن کے امتحان اور جائزے سے بار بار گزرتی ہے۔ اسی لئے عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں کرختگی تلخی اور مرد سے اُکتاہٹ کا انداز آجاتا ہے۔ مگر وہ اب اپنے بچوں، شوہر اور خاندان کے لئے زندہ رہنے کو زندگی کہنے پہ مصر نظر آتی ہے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اُوپر بیان کردہ کردار ان خواتین میں بالخصوص پایا جاتا ہے جو امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی ہوں کہ مردوں سے زیادہ خواتین اپنی امارت کو برقرار رکھنے کی خواہاں اور مشتاق معلوم ہوتی ہیں کہ ان کی شناخت، ان کی ذات نہیں بلکہ وہ نوکر، خانساماں اور اشیاء ہوتی ہیں کہ جو اُن کے شوہر انہیں مہیا کرتے ہیں،

باقی رہیں وہ عورتیں کہ جو اپنی ذات، اپنے علم اور اپنے شعور کے حوالے سے بغاوت یا آزادی کا علم بلند کرتی ہیں۔ وہ ابھی انفرادی جدوجہد کا آئینہ ہیں۔ یہ انفرادی جد و جہد ابھی اجتماعی شکل بن کر ظاہر ہوگی۔ جب تک یہ ممکن نہ ہوا۔ عورت کی جدوجہد اور انقلابی رویہ اختیار کرنے کی داستان الف لیلیٰ کا قصہ ہی معلوم ہوگی۔

حصّہ سوم

نرگسیت

کہا جاتا ہے کہ ہر عورت بنیادی طور پر خود پرست ہوتی ہے۔ مگر اس خیال کو بہت وسعت دینے کا مطلب، اس کو تباہ کرنے کے مترادف ہوگا۔ جیسے لارڈ چے فوکلڈ نے نظریۂ انا پرستی کو تباہ کر دیا تھا۔[1] حقیقت یہ ہے کہ نرگسیت، شناخت کی ایک بہت واضح شکل ہے۔ جس میں انا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور انسان اسے معروض سمجھ کر اس کے پردے میں خود کو مستور کرتا ہے اور عورت خاص کر اس جذبے کی اسیر نظر آتی ہے۔

ہر عشق عرض و معروض کے دائرے میں پابند ہوتا ہے۔ عورت، نرگسیت کی جانب

---

[1] لارڈ چے فوکلڈ کے نظریۂ انا پرستی کا مطلب یہ تھا کہ ہر شعوری انسانی جذبہ اور عمل ذاتی غرض کے لئے ہوتا ہے۔

دو اطراف سے آتی ہے۔ ایک تو مرد کی طرح عضوئے تناسل کی نمائش نہیں کر سکتی ہے پھر وہ مرد کی طرح جنس میں جارحیت کا مظاہرہ نہیں کر سکتی ہے کہ مردانہ سرگرمیاں اس کے لیے شجرِ ممنوعہ ہوتی ہیں۔ ویسے تو وہ مصروف ہوتی ہے۔ مگر بظاہر اس کے کرنے کیلئے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ وہ بطور بیوی، ماں اور گھر کے محافظ کے بھی، اپنی انفرادی حیثیت نہیں بنا سکی ہوتی ہے کہ اصل شخصیت تو مرد کی بنتی ہے۔ وہ ہی سارے دکھوں کے مداوے ڈھونڈتا ہے اور مشکلات کے جنگل صاف کرتا ہے۔ عورت تو اپنا آپ قربان کرنے کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ مگر کچھ عورتیں خود سے پیار کرتی ہیں۔ وہ اپنا بدن آئینے میں دیکھتی ہیں۔ وہ اپنی چھاتیاں ہاتھ میں لے کر خود ہی دیکھتی ہیں اور خود کلامی میں یہ بھی کہتی ہیں کہ میں اپنے آپ کے ساتھ جنسی تلذذ حاصل کروں گی۔ میں اپنے آپ کو حاملہ کروں گی۔ یہ باتیں بچپن میں گڑیا کھیلنے کے تصور سے راستہ پاتی ہیں اور نوجوانی میں یہی خود فریبی اپنی شخصیت کے فروغ کا سرچشمہ بنتی ہے۔ مجھے یاد ہے میں نے ایک نوجوان لڑکی کو آئینے میں اپنے ہی عکس کو چومتے ہوئے یہ کہتے سنا "تم کتنی خوبصورت ہو" یہ عکس دیکھ کر خود فریبنگی اپنے مستقبل میں چاہنے والے کی خواہش کی ترجمانی کرتی ہے۔ ایسی عمر میں اپنے بچپن کی ساحرانہ باتوں کو یاد کرنا یا بنانا بھی ایک عام بات ہوتی ہے۔ پھر فلموں اور ادب کی معروف شخصیات سے مشابہت تلاش کر کے، خوش ہو لینا بھی ایک محبوب مشغلہ ہے یا پھر کام نہ کرنے کا بہانہ تھیٹر جانے کی شکل کی معروفیت بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ اداکارہ اپنے بہت سے ارمان پورے کرنے نکلتی ہے۔ کچھ کے لئے آمدنی اور کچھ کیلئے شہرت اور یہ تمام شکلیں نرگسیت ہی کی شکلیں ہیں۔ بڑی اداکارائیں اپنے خواب کو اپنی اداکارانہ مہارت کے حوالے سے زندہ جاوید کر لیتی ہیں۔ جبکہ تیسرے درجے کی اداکارائیں اوچھے ہتھکنڈوں سے بھی اداکاری کرنے کو زندگی کی معراج سمجھتی ہیں۔ نرگسیت کی شکار خاتون، اپنے فن اور اپنے عشق میں بھی اسی خامی کے باعث، محدود

رہے گی۔ یہ خامی اس کی دیگر سرگرمیوں پر بھی بے طرح اثر انداز ہوگی۔ وہ ہر اس راستے پہ جانے کے لئے تیار ہوتی ہے کہ جہاں وہ شہرت سے ہمکنار ہو سکے۔ مگر وہ کسی بھی کام کے لئے پوری توجہ اور لگن کے ساتھ کام نہیں کرے گی۔ جبکہ تمام فنونِ لطیفہ سخت محنت اور توجہ چاہتے ہیں۔

بہت سی عورتیں اپنی بڑائی اور برتری کے بارے میں با اعتماد ہونے کے باوجود کسی مرد کو اپنے نمائندے کی حیثیت سے ساتھ لئے پھریں گی کہ وہ ان کی صلاحیتوں کا چارٹ لوگوں کو بتا سکے اور خاص کر اُن لوگوں کو کہ جو امارت اور شہرت میں خود بے مثل ہوں۔ ضروری نہیں کہ وہ اپنی اسی کوشش میں کامیاب اور بامراد ہی لوٹیں۔ ہاں یہ محسوس کر کے وہ لوگوں کی نظروں میں ہیں، خود کو اہم اور بامراد سمجھتی ہیں۔ یہ اپنی ناکامی کو بھی بڑی خوبصورتی سے چھپاتی ہیں۔ وہ خود کو پیار، خواہش اور تمنا کے قابل سمجھتے ہوئے، خود فریبی میں مبتلا، خود کو ان ہی سرابوں میں گرفتار رکھتی ہیں۔ یہ خود فریبی جنون اور پاگل پن کی حد تک پہنچا سکتی ہے۔ اس مرض کو "ایریٹومنیا" بھی کہتے ہیں۔ یہ پیشہ ورانہ قسم کا مرض ہوتا ہے۔ جس میں ہر دس مریضوں میں سے ۹ مریض خواتین ہوتی ہیں۔ یعنی وہ تصوراتی عاشق کے بازوؤں میں جھولتے جھولتے، ایسی تصور کو حقیقت سمجھنے لگتی ہیں۔ چونکہ انتہا جذبے اس کے اندر کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر محبت کا تصور سامنے نہ ہو تو نفرت کا احساس جاگزیں ہو جاتا ہے۔ مسئلہ صرف اپنی ذات کو واضح کرنے اور سامنے لانے کا ہوتا ہے۔ گویا مرکز بھی خود اور مرکزِ توجہ بھی خود بنتی ہے۔

نرگسیت کی یہ کامیڈی حقیقت کی قیمت ادا کر کے کھیلی جاتی ہے۔ ایک عورت جو اپنی انا میں گرفتار ہو۔ وہ باقی دنیا سے حقیقی تعلق ختم کر بیٹھتی ہے۔ اگر کوئی اُسے یہ بتائے کہ جو تمہارے سامنے تعریف کرتے ہیں۔ وہ تمہارے پیچھے تمہارے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں اور اپنی ڈائریوں میں کیا کلمات لکھتے ہیں۔ تو وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوگی۔ وہ اپنے

آپ کو بار بار دیکھتی ہے ۔ وہ دوسروں کو بھی اپنی بات کے منوانے کے انداز اور مرتبے سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ وہ اپنے تجربات کو بڑھانا اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنا پسند کرتی ہے ۔ وہ خود محویت اور خود جاذبیت میں مگن رہنا چاہتی ہے ۔ اگر وہ ماں ہے تو کلی طور پر ماں کی تسلیمیت، دوست ہے، تو دوستی میں بغیر کسی دخل اندازی کے وصال و تعلق، ان تمام جذبوں میں اس کی ذاتی وابستگی تام کی حد تک ہوتی ہے کہ وہ خود جاذبیت کے جذبے سے سرشار زیادہ ہوتی ہے ۔ فنکارہ آئسوڈورا، اپنے بچوں کی موت پر واقعی روئی تھی ۔ مگر جب اُس نے سمندر میں اُن کی راکھ بہائی تھی تو اُس وقت اس کے چہرے کے جذبات ماں سے زیادہ فنکار کے جذبات معلوم ہوتے تھے ۔

نوبالغ ایسی حس نرگسیت کے باعث، غیر مطمئن مستقبل کا مقابلہ بھی توانائی کے ساتھ کرتے ہیں ۔ مگر یہ حسیت جلد ختم ہونی چاہیئے ۔ جو خاتون ایسی حسیت میں گرفتار رہتی ہے۔ وہ بطور میاں بیوی قلعہ بند اور بطور بیوی، صرف موت کے ہاتھوں آزادی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں ۔ وہ نرگسیت میں مبتلا خاتون کہ جو اپنے تصوراتی پیکر سے خود اپنی شناخت کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی تباہ کر لیتی ہے ۔ اُس کی یادیں ساکن اور اس کے اطوار یکساں نوعیت کے ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے الفاظ بار بار دہراتی ہے ۔ اسی لئے خواتین کی لکھی ہوئی یادداشتیں اور سوانح عمریاں، اپنی ذات کے بارے میں بہت کچھ اور زمانے کے بارے میں نیستی کی داستان ہوتی ہیں ۔

بد قسمتی یہ ہوتی ہے کہ وہ عورت اپنے حسنِ ظن کے باوجود، اس امر سے آگاہ ہوتی ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے ۔ یہ بھی جانتی ہے کہ اصل اور خود ساختہ پیکر میں کوئی ربط نہیں ہے کہ خود ساختہ بہر حال نقلی اور محض خیال ہوتا ہے ۔ نرگسیت کے مریض میں اکتاہٹ اور بیزاری کا بنیادی جذبہ ہوتا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو کُلّی طور پر محسوس کرنے اور مطمئن ہونے کے قابل محسوس نہیں کرتی ہے ۔ گویا وہ خود کو بدترین غلامی میں گرفتار کر دیتی ہے کہ وہ اپنے حقیقی پیکر

پر اعتماد کرتی ہی نہیں ہے۔

مسئلہ یہ بھی نہیں کہ اس کا بدن اور چہرہ اس گوشت کے بنے ہیں کہ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اپنا حسن اور دلکشی کھوتا جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایک مہنگا سودا ہے کہ خود ساختہ آدرش کی پرورش، پرستش اور پھر اُسی بُت کا تمہارے سامنے پاش پاش ہونا۔ میری بلشکر سلونے دولت سے شادی کی۔ آئسوڈورا ڈنکن یا سیسل مورل نے جو سونا اپنے تاجوں کے گرد اکٹھا کیا تھا۔ اس کی قیمت ادا کرتے، اُن کی زندگی گزری۔ چونکہ عورت کی قسمت، مرد کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ اپنی کامیابی اِسی امتحان میں گردانتی ہے کہ کتنے مردوں کو اُس نے اپنے پیچھے لگایا ہے۔ مگر یہاں پھر باہمی اعتماد کی بات آجاتی ہے۔ مرد کو پیچھے لگانا، مساوات کے عمل کا عکس نہیں ہوتا ہے۔ امریکی عورت کہ جو مرد کا آدرش ہوتی ہے، وہ اپنے مداحوں کی غلام بن جاتی ہے۔

نرگسیت زدہ خاتون، ہسٹریا کی طرح، دوسرے پہ انحصار کرتی ہے۔ اگر وہ ایک مرد کے غضب اور ظلم سے بغاوت کرتی ہے۔ تو وہ ایک سے بے شمار مردوں کے غضب اور ظلم کا نشانہ بنتی ہے۔ وہ جس دنیا کو اپنے لائق نہیں سمجھتی ہے۔ اس کے دیئے ہوئے پیمانوں پہ زندگی بسر کرنے پہ مجبور ہوتی ہے۔ وہ مغرور ہونے کے باوجود، اپنی نامساعد صورتِ حال سے آگاہ ہوتی ہے اور اسی لئے بے چین، ضرورت سے زیادہ حساس، اکتائی ہوئی اور اپنے غرور میں سرشار رہتی ہے۔ وہ عمر میں جس قدر بڑھتی جاتی ہے۔ اتنی ہی تعریف کے لئے بے چین، اپنے اِردگرد، متلاشی رہتی ہے اور اپنی ذات کی تسکین کے لئے مصنوعی ہالے بناتی رہتی ہے۔ نرگسیت کی شکار خاتون کے لئے یہ ضرب المثل درست ہے کہ "وہ جو اپنی زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ گنواتا بھی ہے"۔

عشق میں گرفتار عورت

عشق کا لفظ، دونوں جنسوں کے لئے ایک ہی مطلب رکھتا ہے اور یہی غلط فہمی، ان دونوں کو تفریق پہ مائل بھی کرتی ہے۔ بائرن نے ٹھیک کہا تھا۔ مرد کا عشق، مرد کی زندگی میں ایک الگ چیز ہوتی ہے۔ جبکہ عورت کے لئے یہ پوری زندگی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ نیٹشے[1] نے اِسی مسئلے کو یوں بیان کیا ہے۔

عشق کا مجرد لفظ، مرد اور عورت کے لئے دو مختلف مطالب کا بیان ہوتا ہے۔ عورت کے لئے عشق کا کیا مطلب، جسم اور رُوح کی مکمل سپردگی ہے۔ یہ بلا شرط اور بلا کم و کاست سب کچھ عشق کی بارگاہ میں قربان کر دینا عورت کا ایمان[1] بن جاتا ہے۔ جبکہ مرد کے لئے عشق، عورت کا عشق طلب[2] کرتا ہے۔ خود دینے یا قربان کرنے کا سوچے

---

[1] نیٹشے کا فلسفہ

[2] کہ عورت کو اپنا آپ پیش کرنے کا حوصلہ ہو۔

تو وہ مرد نہیں ہو گا۔

تاریخ میں بڑے جذباتی عاشق نظر آتے ہیں۔ مگر عظیم عاشق کم ہی نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی محبوبہ کے سامنے دو زانو ہو کر صرف ایک طلب کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور وہ اس کے بدن کی طلب ہوتی ہے۔ وہ اُسے اپنی زندگی میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی زندگی نہیں بننا چاہتے اور عورت بھی اپنے وجود کو عشق میں مبتلا ہو کر نفی کی منزل تک لے آتی ہے۔ سیسل سیوج نے بھی کہا ہے کہ عورت کو عشق میں اپنا آپ فراموش کر دینا چاہیئے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ عورت بغیر محافظ کے بیکار ہوتی ہے۔ بغیر محافظ وہ بکھرا ہوا گلدستہ معلوم ہوتی ہے۔"

ہمیں یہاں قانونِ قدرت سے ورا، عورت مرد کے مقام کے حوالے سے عشق کے بارے میں تجزیہ کرنا ہے۔ فرد کہ جو خود موضوع ہے، اگر اس کی کسی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔ وہ اپنے جذبے اور خواہش کے مطابق، گرفت مضبوط کرنے اور حاصل کرنے کی جانب ملتفت ہوتا ہے۔ مگر ایک تلازمۂ تخلیق، معروض کی کیفیت کو نہ سمجھتے ہوئے۔ اس کو مساوات کا درجہ نہیں دیتا ہے۔ اب عشق میں عورت کے لئے اور کوئی راستہ نہیں رہتا کہ وہ روح اور جسم کے ساتھ، عاشق کی گرفت میں ہو۔ عورت چونکہ ماتحت اور مالی طور پر غلام ہوتی ہے۔ اس لئے باپ، بھائی یا محافظ جیسے جلادوں کے سامنے ہتھیار پھینک کے، عاشق نما خاوند یا محافظ کے سامنے اپنا آپ پیش کر دیتی ہے کہ یہ غلامی اُسے آزادی کی نعمت کے برابر معلوم دیتی ہے۔ وہ اس نعمت کی قیمت اپنے بدن، جذبات، برتاؤ، سلیقہ اور ہر سانس کی گواہی سے دیتی ہے اور مرد کو حقیقت کی سب سے بڑی سچائی کے طور پر قبول کرتی ہے۔ اسی لئے، عشق، عورت کے لئے مذہب کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں۔ نوبالغ لڑکی، اپنے آپ کو مردوں کے ساتھ شناخت

کرنے میں عزت محسوس کرتی ہے۔ جب وہ یہ جذبہ چھوڑ دیتی ہے۔ تو پھر وہ خود کو مردانگی میں جذب کرنے کی منزل پہ آتی ہے۔ وہ کسی خاص مرد کے ساتھ عشق میں مبتلا ہو۔ یہ منزل تو بعد میں آتی ہے۔ پہلی منزل تو ہوتی ہے کہ اُسے سارے مرد اچھے لگتے ہیں۔ ہاں ذرا بہتر کلاس کا مرد، اس کے لئے خوش بختی بنتا ہے۔ لڑکی کیلئے مرد کی وجاہت، امارت، بدن، مرتبہ یا فنکارانہ طور پر ممتاز ہونا، یعنی کوئی بھی چیز اچھا لگنے کے لئے کافی ہوتی ہے اور ان سب میں سب سے مشترک دممتاز۔ اس کی مردانگی کا ممیز ہونا ہے۔

اس کا کسی اور سے مماثل ہونا، اس کی انفرادیت کو تباہ کر سکتا ہے۔ فاصلے سے عشق، مسحور کن لگتا ہے۔ عشق کی خواہش، جذباتی عشق کی منزل پہ اسی وقت آتی ہے۔ جب اس میں وصال کی کوئی منزل ہو۔ کئی خواتین جنسی وصل کے بعد ہی۔ مرد کے سحر میں گرفتار ہوتی ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ عورت اپنے محبوب مرد کے تشخص میں ناکام رہتی ہے۔ عشق، عورت کی زندگی میں بھی ایک حصّہ ہوتا ہے۔ کُل نہیں، خاوند، گھر، بچے سماجی ذمہ داریاں اور جنسی تلذذ، یہ ساری کیفیتیں، ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ بہت سی عورتیں، لمحاتی جذباتی کیفیت کی روانی کو عشق سمجھ لیتی ہیں۔ ہاں اگر متبادل راستے پہ بہتر زندگی اور سماجی مرتبے کا شوق پورا ہوتا ہے۔ تو ایسے عشق کو کامیابی پہ پہنچانا، عورت اپنے لئے افتخار سمجھتی ہے۔ آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کے لئے، عشق کا راستہ عورتوں کو محبوب ترین راستہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لئے ذمہ داری اُٹھانے کا راستہ، سب سے اذیّت ناک ہوتا ہے۔ مرد، بڑی عمر کی عورتوں سے، گھر کے معاملات، سماجی تقاضے اور ذمہ داریوں کا درس لیتا ہے۔ مگر یہ مرحلہ صرف لمحاتی مسئلہ ہوتا ہے۔ جبکہ عورت کو ہر راستے سے گزرتے ہوئے، مستقبل کی نمائش گاہ کی ترغیب' مسحوریت کی حد تک دکھائی جاتی ہے۔ جب وہ پختگی اور سمجھداری کی منزل پہ پہنچتی ہے

تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساری قوت ایک شکست خوردگی کی جہت میں صرف ہو گئی ہے۔

ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ عورت اپنے باپ کا تصور، اپنے محبوب میں تلاش کرتی ہے، نہ صرف اس لئے کہ وہ باپ ہو کر بچی کو محبوب ہوتا ہے اور ہر مرد ایسی مسحوریت کے ہالے میں عورت کو نظر آتا ہے۔ عورت ایک فرد کو دوسرے فرد میں منقلب ہوتا دیکھنا پسند نہیں کرتی کہ اُسے معلوم ہے کہ عشق پھر اُسے ماں اور باپ کے سماجی رشتوں کی لڑیوں میں دوبارہ پرو دے گا۔ وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ اس کے سر پر ایک چھت ہو۔ دیواریں ہوں کہ جو اُسے دنیا کے سامنے بے یار و مددگار نہ محسوس ہونے دیں۔ وہ اپنے شوہروں سے "پاگل لڑکی، بالکل بچی ہو" کی قسم کے فقرے سن کر بڑی خوش بھی ہوتی ہیں۔ اس کے بالکل متضاد، کچھ عورتوں کو بڑا بننے کا شوق ہوتا ہے۔ جو عورتیں بچہ جننا پسند کرتی ہیں، وہ مرد کے بازوؤں میں، اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کرتی ہیں۔ مرد اُسے میری ننھی گڑیا کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور وہ جواباً اُسے تمہاری ننھی گڑیا کہہ کر خط کا جواب دیتی ہے۔ لڑکیاں خواب بھی یہ دیکھتی ہیں کہ مجھے تسخیر کرنے والا کب آئے گا۔

سارے مذاہب میں خدا کی عبادت، آپ کی مکمل سجدہ ریزی اور خدا کی قبولیت اور برتری کی تسلیمیت کی داستان ہے۔ جب عورت خود کو مرد کے سپرد کرتی ہے تو اپنے سارے عالم اور سارے وجود کو سپرد کرتی ہے۔ بہت سی عورتیں جوابی محبت کے بغیر، خود سپردگی کی منزل پہ نہیں آتی ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو مرد کی محبت کی نگاہوں کا مرہونِ منت سمجھتی ہیں۔ محبت میں گرفتار عورت، خود کو عام درجے اور مقام سے بلند تر سمجھتی ہے اور اپنی اسی برتری کی شہادت وہ اپنی جنسیت اور نرگسیت کے اتصال سے لیتی ہے۔ اَنا پرست عورت، بغل گیری کو بھی مغلوبیت کے مترادف سمجھتی ہے اور یوں وہ یخ بستگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ کچھ عورتیں، محبت کی گہرائی اور گیرائی کی ضمانت اور

مظاہرے بغیر، مرد سے تعلق قائم نہیں کرتی ہیں اور پھر عشق بھی عورت کی مکمل سپردگی ہی کو واقعیت سمجھتا ہے۔ اس تعلقِ خاص کو محبت، جذباتیت اور خوشی کے ساتھ یاد کرنے کا سلسلہ، عورت کے لئے بھی بہت دلچسپ اور شعلۂ عشق کی مانند ہوتا ہے وہ اپنے مجازی خدا اور اپنے محبوب میں خود کو قطعی طور پر غلطاں کرنے اور خود کو نرادش کرنے پر ہی کلی عشق کا تصور رکھتی ہے۔ جبکہ مرد، جس قدر عورت سے طلبگار ہو، عورت اتنا ہی دینے اور قربان ہونے کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ اس کے پھٹے کپڑوں کو سیتی، پیوند لگاتی۔ کپڑے دھوتی، بکھرے کاغذ مرتب کر کے رکھتی۔ اس کے سرکاری خطوں کے جواب تیار کرتی اور اس کے مسودات نقل کرتی نظر آتی ہے۔ یعنی وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک محبوب کے لئے قربان کرتی نظر آتی ہے۔ مگر یہ کیفیت اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ وہ محبت کا سحر قائم رہتا ہے۔ اگر وہ اس توقع سے کم پیار کرتا ہے۔ جو عورت چاہتی ہو۔ اگر وہ عورت کو خوش رکھنے میں کامیاب نہ ہو۔ تو اس کی ساری ترغیبت، خود بخود احتجاج میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ خود سے بھی نفرت کرنے لگتی ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو سزا دیتی ہے۔

سزا کا انداز ہر طبقے میں مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً طوائف، اپنے پیشے کی سزا، اس مرد سے مار کھا کر لطف کی صورت میں محسوس کرتی ہے۔ جسے وہ اہمیت دیتی ہو کہ وہ اسے اپنے سے طاقتور اور اس قیمت سے بیش قیمت سمجھتی ہے جو اُسے ایک رات کی صورت میں مل جاتی ہے۔ اس کے تصور میں وہ مرد اس کو مشکل سے مشکل حالات سے چھڑا کر عزت اور وقار دلا سکتا ہے۔ محبت کی منتہا "تو من شدی من تو شدم" کی مثل سے سمجھی جاتی ہے۔ عورت ہی اپنے طور کوشش کرتی ہے کہ وہ کتابیں پڑھے جو اس کا محبوب کہے، ان لوگوں سے ملے، جن سے وہ ملے یا ملنے کی اجازت دے۔ وہ موسیقی سنے جو وہ پسند کرے اور وہ منظر تک پسند کرے کہ جو اس کا محبوب پسند

کرے ۔ وہ اس کی رائے، اختلافات، دوستیاں، دشمنیاں یعنی اپنے سوالوں کے جواب اس سے سننے کی متمنی ہوتی ہے۔ یہ بھی کہتی ہے کہ جو روٹی، پھل یا پھول اس کے محبوب کے ہاتھوں نہیں آتے، ان میں نہ رنگ ہوتا ہے۔ نہ مزا نہ روپ، مرد بھی محبت میں ڈوب کر، "ہم" کا استعارہ، دونوں کے اشتراک کے لئے استعمال کرتا ہے عورت بھی یہی چاہتی ہے کہ مرد بھی عورت کی طرح، اپنا وجود اور اپنی سانسوں کا ہر حساب، عورت کے حوالے سے مرتب کرے۔ مرد، اگر عورت پر اعتبار کرتا ہے۔ تو وہ چاہے کہیں ہو۔ مرد مطمئن ہوتا ہے، جبکہ عورت مرد کو اپنی نظروں سے اوجھل دیکھ کر بے چین، خوفزدہ اور پریشان ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اس کے سونے سے بھی خائف ہو جاتی ہے اور نیند کو بھی اپنا رقیب سمجھنے لگتی ہے۔ مرد، عورت کو بغل گیر ہونے کے لئے جگاتا ہے۔ جبکہ عورت، مرد کے سونے کو اپنے نہ سونے کے باعث، اپنے حق پہ غاصبانہ قبضہ سمجھتی ہے۔ وہ مرد کو قیدی بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ محبت کی یہی کوتاہ دامنی ہے کہ جو دو محبت کرنے والوں کے وصال کو زندہ درگور کر دیتی ہے۔ کافی عورتیں وصال کی اس انتہا سے واقف ہوتی ہیں اور وہ مرد کو آزادی کی فضا کہ جہاں وہ اپنی مردانگی کے جوہر اپنی محبوبہ اور دنیا دونوں کو دکھا کر داد حاصل کر سکے، فراہم کرتی ہے۔ مگر ساتھ ہی متوقع ہوتی ہے کہ مرد بھی جوابی فراخدلی اور اظہار اعتماد کو کار فرما رکھے گا۔ عورت اگر اس کے سامنے خدمت کر کے، خوش ہوتی ہے۔ تو مرد کو بھی اس خدمت کا اعتراف اور اس محبت کا احساس ہونا چاہیئے۔ ورنہ عورت کے دل میں یہ احساس سر اٹھاتا ہے کہ کیا واقعی اس شخص کو میری ضرورت ہے؟ جو شخص محبت کرتا ہے وہ محبت، شفقت، ملائمت اور توجہ کے ساتھ اسی خاتون کی طلب کرتا ہے اور کسی اور کو اس چاہت کے ساتھ نہیں بلاتا ہے۔ مرد کی خواہش مگر بہت جلد، تبدیلی کی خواہاں نظر آتی ہے۔ اگر کوئی عورت اس کے حصار میں مقید ہو جائے تو یہ وصال کی خوشبو، کہانیوں میں پیش کردہ کرداروں

کی طرح، ہوا ہو جاتی ہے۔
ویسے اگر مرد اس کے ساتھ چپٹا رہ بھی جائے تو کوئی لازمی بات نہیں کہ وہ عورت مرد کے لئے کوئی ضروری اہمیت رکھے، ہاں عورت کے تلطف پہ، مرد کا خاموش رہنا یا مُسکرا دینا ہی، نعمتِ دو جہاں ملنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ وہ مرد کو بستر پر جذباتی لمحات میں پوچھتی ہے "کیا تم مجھے کل کی طرح، پچھلے برس کی طرح، اولین سال کی طرح، اولین دن کی طرح چاہتے ہو" یہ سارے سوال جنسی جذباتیت کے دوران سیکڑوں یا مسکراہٹوں کی پھوار کے دوران وارد ہوتے ہیں۔ اس پر جواب ملے، مسکراہٹ ملے یا خاموشی، وہ سب کو اپنے حق میں مثبت متصور کر کے، خوش ہی رہ لیتی ہے اور مرد، جب چاہتا ہے۔ تعلقات ختم کرنے کی اطلاع دے کر، اپنی طرف سے حق ادا کرتا ہے۔ عورت سے پوچھو تو مرد چاہے، خاموش، بزدل، لیا دیا، اظہارِ محبت میں کمزور، شرمیلا ہو یا بڑبولا۔ عورت کو پسند ہو سہی، وہ پھر اس کی ہر ادا کا جواز پیدا کر لیتی ہے "وہ ہر ایک سے بے حد حسد کرتا ہے۔ وہ مجھے کسی کے سامنے بیٹھنے نہیں دیتا۔ وہ مجھے کسی سے ہاتھ نہیں ملانے دیتا۔ وہ تو میرے انتظار میں گھر پر ہی یا ٹیلیفون کے پاس بیٹھا رہتا ہے" ادھر مرد سے پوچھو تو وہ کہتا ہے کہ "یہ تو میرے پیچھے پڑی تھی۔ میں اُسے کب تک برداشت کرتا۔ میں اس کا دوست ضرور تھا۔ مگر میں اُسے گھر پر نہیں بسا سکتا تھا" وغیرہ وغیرہ

دونوں سمت سے برابر کی محبت ہو تب بھی عورت خود کو مرد کے حوالے سے باعزت محسوس کرتی ہے مگر مرد، خود کو عورت کے حوالے سے بامراد کہتا کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ مگر اپنی آزادی عورت کے معیار کے علاوہ اپنی مردانگی کے اعلان کے لئے برقرار رکھنی چاہتا ہے۔ جبکہ عورت کی مکمل انحصار کرنے کی ضرورت اور عادت مرد کو مزید خود کو برتر سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مرد کی غیر حاضری پہ عورت کا یہ

کہنا کہ تمہارے بغیر مجھے موسم، دروازہ، منظر، ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی"۔البتہ وہ محبت کہ جس میں عورت مرد، سماجی اور معاشی طبقات میں برابر کے حصے دار ہوں۔ وہاں تعلقات میں بھی اور طرح کی نہج ہوتی ہے۔

مرد نے عورت کو اپنے انتظار کی گھڑی کی سوئی پر لٹکایا ہوتا ہے۔ وہ سارا دن اکیلے صرف مرد کی واپسی کے انتظار میں گزار دیتی ہے۔ اس کے لئے کھانے پکاتی ہے۔ گھر سنوارتی ہے۔ وہ سوتا ہے تو اس کے جاگنے کے انتظار میں چائے لئے بیٹھی ہوتی ہے۔ پھر وہ شام کو باہر جاتا ہے تو پھر وہ اس کے انتظار میں بیٹھی، اسی زعم میں رہتی ہے کہ وہ صرف ایک مرد کے لئے ہے اور ایک مرد، اس کی توجہ کا مرکز ہے۔ مجھے ایک عورت کا واقعہ معلوم ہے کہ وہ ہر دفعہ اپنے محبوب کا استقبال اس حیرت کے ساتھ کرتی تھی کہ بے ساختہ کہہ اٹھتی تھی "اوہ! تم آ گئے۔ میں نے تو سوچا تھا۔ تم شاید نہ ہی آؤ"۔ اسی طرح وہ عورت کہ جسے معلوم ہے کہ اس کا شوہر کسی اور عورت کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ سب لوگوں کے سامنے بار بار کہہ اٹھتی ہے کہ میرے شوہر تو مجھے والہانہ طریقے پر چاہتے ہیں۔ وہ میرے علاوہ کسی اور کو پسند ہی نہیں کر سکتے۔ عورت میں ایک اور خرابی ہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں دفعہ اپنے آپ سے یہ سوال کرنے کے علاوہ، کہ کیا وہ، واقعی مجھ سے پیار کرتا ہے"۔ سارے زمانے کے سامنے یہ اعلان کرنے والی خاتون اپنے آپ سے یہ سوال کم ہی کرتی ہے کہ وہ کیا واقعی اس سے پیار کرتا ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرد میں محبت کا ذائقہ کم تر ہو گیا ہے اور عورت نے اُسے جلا دینے کے لئے ایک اور رقیب گھڑ لیا ہو۔ عورت محبت کو ایک آزاد جذبہ بھی سمجھتی ہے اور یہ بھی سمجھتی ہے کہ "اس کا مرد" ہمہ وقت اس سے مسحور ہے۔ مرد ہر وقت عورت کو اپنے ساتھ وابستہ متصور کرتا ہے۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کرتا کہ عورت بھی ایک فرد ہے کہ جو اس سے الگ بھی ہو سکتی ہے۔ حسد بھی اس کے لئے محبت کی طرح ایک وقتی گزرتا

جذبہ ہوتا ہے کہ جب اس کی تجارت ختم ہو رہی ہو یا زندگی ناکامیاں دکھا رہی ہو تو پھر وہ عورت کو بھی اسی سلسلے کا حصہ سمجھتا ہے۔

عورت اپنے محبوب کو پیار کرتے وقت، ہر لمحہ ایک امتحان سے گزرتی ہے۔ جس لمحے اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک حد سے کم چاہی جا رہی ہے۔ وہ فوراً رقیبانہ انداز پہ اُتر آتی ہے اور اب وہ ہر عورت کی جانب اپنے محبوب کی نظروں کو خود سے بہتر متصور کر کے آمادۂ پیکار ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت یہ دیکھتی ہے کہ وہ کسے دیکھ رہا ہے۔ کیا دیکھ رہا ہے۔ کیوں دیکھ رہا ہے۔ اس نے سب کچھ محبت کے حوالے سے حاصل کیا ہوتا ہے اور اب وہ سب کچھ نفرت کے حوالے سے فنا کرنا چاہتی ہے۔ حسد، اس کی زندگی میں زہر گھول دیتا ہے۔ وہ محبت کو یا تو عبادت بناتی ہے یا پھر ہمیشہ کے لئے ختم کر دینی چاہتی ہے۔

مغرور اور متفکر ہونے کے باوجود، عورت غلط فہمی کی بنا پر ہی، حسد کا شکار ہو سکتی ہے۔ غیر یقینی محبت کی صورت میں، ہر عورت غاصب اور رقیب لگ سکتی ہے۔ ایسی محبت، عورت میں دوسری عورتوں سے محبت کرنے کے جذبے کو بھی بھسم کر دیتی ہے۔ حسد، اس کی تنہائی کو اور بھی بڑھاتا ہے اور اس کے انحصار کرنے کے دائرے کو اور بھی محدود کرتا ہے۔ ویسے تو ایک شوہر کو بھی سنبھالنا بڑا مسئلہ ہے۔ مگر محبوب کو سنبھالنا تو پوری نظامت کو چلانے کے مترادف ہے۔ ایک عورت جو اپنی نرگسیت کے حصار میں مرد کو بھول چکی تھی۔ اس کو رقیبانہ پیش قدمی کے سامنے پھر دست بہ گریباں ہو کے، حالات کا از سر نو جائزہ لینا ہوتا ہے۔ اب وہ اپنے لباس محفل میں برتاؤ اور اپنے انداز کو منفرد قائم رکھنے کی شعوری کوشش کرتی ہے۔ یہ ایک مجاہدانہ مجادلہ ہوتا ہے جو عورت اپنی خوشی کو واپس لینے کے لئے حتمی طور پر کرتی ہے۔ مگر شکست کا غیر شعوری احساس، اس مجادلے کو ہاری ہوئی بازی کی شکل کے مناظر پیش کرتا

ہے۔ اب مرد، اپنے بچاؤ کی خاطر حملہ آور ہوتا ہے اور مغرور سے مغرور عورت بھی سادہ لوحی اور مفاہمت کی دہلیز پہ سراپا التماس نظر آتی ہے۔ وہی عورت اپنی رقیب کی طرح ملبوس، ساحرانہ انداز اختیار کرتی اور یوں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ کرتی نظر آتی ہیں۔ جو اُس کے محبوب کی نظر میں دوسری عورتوں میں خوبیاں قرار پاتی ہیں۔ عورت کا گویا واضح طور پر اور مکمل وفادار ہونا بھی اس کی برائی بن جاتی ہے کہ ایک یقین، دوسرے گمان کی جانب سفر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ جب عورت کو محبت کے بھرپور ہونے کو غلطی کی شکل میں دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو پھر وہ خود بھی دل پھینک بن جاتی ہے۔ اب محبوب کو اس کی لاتعلقی اور بے توجہی کا مزا چکھا کر، وہ لطف اندوز ہوتی ہے۔ یہ خود پیدا کردہ فاصلہ، عورت کو کبھی کبھی فائدہ بھی پہنچاتا ہے کہ مرد یعنی اس کا اصل محبوب، اسی ساحرانہ چال میں گرفتار رہتا ہے۔ مگر عورت مکمل کر دل پھینک نہ بن سکتی ہے نہ بنی ہے کہ واضح شکل، اس کی طلاق اور قطعی لاتعلقی کا سبب بن سکتی ہے۔

کچھ عورتیں شادی یا بچوں کے ذریعہ، مرد کو دامِ محبت میں گرفتار رکھنا چاہتی ہیں۔ مرد تو ناکام شادی یا عشق کے بعد بھی، معاشرے میں مرد رہتا ہے کہ بقول عوام مرد کا کیا جاتا ہے۔ مگر عورت تو بدنام بھی ہوتی ہے، لوگ شادی سے بھی گریز کرتے ہیں اور معاشرے میں مقام بھی نہیں دیتے۔

بنیادی اور واقعی عشق، دونوں کی آزادی اور انفرادی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے باہمی انہام کا دوسرا نام ہے۔ جس دن عورت کی کمزوری۔ اس کا عشق نہیں رہے گا۔ بلکہ اس کا عشق اس کی طاقت بنے گا۔ اس دن عورت اپنے آپ سے چھپنے اور بچنے کے لئے عشق نہیں کرے گی بلکہ اپنے آپ کو سمجھنے کے لئے اس راستے کو اپنائے گی۔

روحانیات

عشق، عورت کی زندگی کی منتہاؤں میں شمار ہوتا ہے۔ جب عورت، عشق کو مرد ول میں تلاش کرتی ہے تو گویا وہ خدا کی تلاش کر رہی ہوتی ہے۔ اگر حالات اس کو انسانی عشق سے محروم رکھیں تو وہ خدا کی ذات کو وجود سمجھ کر عشق کرنے لگتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ عشق نے اور خاص کر روحانیات میں جذب ہو کر، کچھ لوگ مجسم بھی ہو گئے۔ جبکہ اگر یہی واردات عورت پہ وارد ہوئی تو وہ باقاعدہ جذباتی کیفیت تھی۔ عورت کو تو پہلے سے دو زانو ہو کر ادب کرنا سکھایا جاتا ہے کہ منبر پر اس کا سرتاج اور مرد جلوہ فگن ہوتا ہے۔ معشوق کا احوال تو وہ اپنے یقین اور اعتماد کے حوالے سے ہی جانتی اور پہچانتی ہے۔ محبوب اور خدا کا عشق باہم گھل مل جاتے ہیں۔ مخلوط کرنے والا بھی زمین اور آسمان کے فرق کو نہیں پہچانتا۔ وہ خدا کا بندہ ہوتا ہے اور خدا اس میں محلول ہو کر، بندگی کا شرف بھی حاصل کر لیا ہوتا ہے۔ میڈم لیون نے فادر لاکومب کے ساتھ اپنی ملاقات کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ مجھ میں وقار کی قوت، ان کی رُوح کے راستے سے منتقل ہوتی نظر آتی تھی۔ راہب نے اس کی روح اور دل کی ویرانی کو فنا کر کے اس کی رُوح کو شادابیوں کی پہنائیوں سے آشنا کیا تھا اور میڈم گیون کا کہنا ہے کہ وہ لمحے صرف روحانیات کے لمحے نہیں تھے۔

میں راہب کو خدا سے ممیز نہیں کر سکتی تھی۔ یہ کہنا کہ وہ فرد کی محبت کے ملے تھے، غلط ہے، وہ خدا نہیں تھا۔ مگر فرد اور ایک عام فرد سے سوا کچھ اور شخص تھا۔ مرد تو عورت کی محبت کی منتہا کے لئے واسطہ بنتا ہے۔ یہاں مجذوبیت اور روحانیت میں تمیز کرنا بہت ضروری ہے، مجذوب سمجھتی ہے کہ وہ کسی لا محدود اور نا معلوم طاقت کے حوالے سے محبوب تک پہنچ رہی ہے۔ مجذوب اپنا بدن، اپنے وسائل اپنے جذبات، گویا اپنی ہر چیز خدا اور نا معلوم قوت کے لئے صرف کر سکتی ہے کہ یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ مجذوبیت یا تو ماورائی یا جنسی سطح پر اظہار پاتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک بدن ہی تو ہوتا ہے کہ جو انسان یا خدا کے سامنے پیش کرنے کے لئے عورت کے پاس ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جسمانی اور جنسی عشق ہی مجذوبیت کی اگلی منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مگر اسے باقاعدہ اور مسلمہ کلیے کے طور پر مانا نہیں جا سکتا ہے کہ روحانی اثرات کے موضوعاتی اور معروضی نتائج دیکھے جاتے ہیں۔ سینٹ ٹریسا، بہت ڈرامائی طریقے پر، فرد اور نا معلوم حقیقت کے درمیان، ایک عورت، ایک تجربہ ماورائے جنس، بلکہ ایک ایسی شخصیت کے موجود رہی کہ جسے جان آف کراس سو سو کے ساتھ تقابل میں رکھا جا سکتا ہے اور کچھ لوگ اسے نرگسیت ہی کی توسیعی شکل قرار دیتے ہیں۔ کچھ عورتیں اپنا آپ، اپنا بدن اور اپنے ہوش و حواس تک، مجذوبیت میں گنوا بیٹھتی ہیں۔ ہر چند راہبوں، فقیروں اور مجذوبوں میں بھی یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ مگر عورت اگر مجذوب ہو جائے تو یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ مزاروں کی جالیوں کو چومنا، ہار، چادریں اور چڑھاوے چڑھانے، پتھروں کو چومنا جیسا کہ اٹلی، اسپین کے علاوہ مسلم ممالک اور ہندو مذہب میں بھی ہوتا ہے اور ایسی رسومات میں عورت ہی نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔

خدا یا قوتِ نا معلوم، عورت کے لئے، شوہر کی شکل میں در دد کرتی ہے کہ عروسی جوڑے، عیسائی، مسلم، ہندو اور دیگر مذاہب میں، خدا کے سامنے سر بسجود ہو کر یا

حاضرو ناظر جان آپس میں عہد کرتے ہیں اور جس عہد نامے کا بنیادی مقصد اور عنوان، عورت کی اطاعت اور مرد کی حکمرانی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ (حالانکہ دین کے حساب سے کئی مذاہب مع مسلم مذہب عورت کی اطاعت سے زیادہ شریکِ حیات اور ایک دوسرے کے لئے لباس ہونے کا تصور، منظرِ عام پر آتا ہے)۔ پھر شبِ عروسی کے بعد، خون سے بھرا کپڑ دکھانے کی رسم، بہت سے ممالک میں عام ہے اور یہ رسم ، بل فائٹنگ، مار دھاڑ، فتح حاصل کرنے اور تسخیر کرنے کے استعارے ہیں۔ اس طرح عورت کو بالیقین فتح کرنے کا منظر نامہ بتانے کے لئے، یہ سب کچھ کہا جاتا ہے۔ عورت، روحانیات پر کس قدر اعتماد کرتی ہے۔ اس کا ایک جائزہ یہ ہے کہ ۲۲۱ افراد میں صرف ۷ہم فرد اور باقی ساری خواتین جن میں سے بیشتر حیض بند ہونے کے بعد کی عمر سے متعلق تھیں۔ سب کی سب روحانیات سے شغف رکھتی تھیں۔ زیادہ تر خواتین کے خواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام (اگر عیسائی ہوں تو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا پھر پیر فقیر آکر دنیا ترک کرنے اور خدا سے لو لگانے کی ترغیب دیتے ہیں اور اگلے دن سے درگاہوں، پیروں، فقیروں، عرسوں اور زیارتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

یہ سارا سلسلہ اور فلسفہ، نرگسیت ہی کی ایک شکل ہے۔ زندگی کی مصروفیت اور کارکردگی بھی روحانیات کے اثرات کو واضح کر سکتی ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ زندگی کو حتمی شکل میں نہ محسوس کرتے ہوئے، اس آسرے کو بھی آزمانا پڑتا ہے کہ عورت کسی مافوق الفطرت شے سے رابطہ قائم کرے یا اپنے ہمزاد کا سوچے، خدا کو ہمرکاب سمجھے۔ یا کسی موجود شخص سے ایک مصنوعی ذہنی رشتہ اپنے طور پر قائم کرے۔ ان تمام حالتوں میں وہ حقیقی دنیا پر اپنا اثر اور تسلط نہ رکھنے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ اپنے معروض ہونے کو مانتی اور اپنی آزادی کے فقدان پر احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی آزادی کو مجروح کئے بغیر کسی سالم صورت میں رواں رکھنے کے لئے روحانیات ہی کا وسیلہ سب سے معتبر ٹھہرتا ہے۔

حصّہ چہارم

ایک آزاد عورت

فرانسیسی قانون کے ماتحت، بیوی کی ذمہ داریوں میں حکم برداری کا فریضہ شامل نہیں اور ہر شہری کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ مگر یہ اصولی باتیں، خیالی اس وقت تک رہتی ہیں۔ جب تک کہ معاشی آزادی، فرد کو فرد کا مقام نہیں دلواتی۔ ایک عورت کہ جو مرد کے کمائے ہوئے پیسے پہ پلتی اور اپنی روزمرہ بسر کرتی ہے۔ وہ مرد سے رہائی محض اس لئے حاصل نہیں کرتی کہ اس کو ووٹ کا حق حاصل ہوتا ہے کہ منفی آزادی نے اس کے کردار اور مقام کو اور بھی زیادہ مجروح کیا ہے۔ وہ اپنے حصار میں رہ کر اور بھی تنگ دائرہ زیست میں مقید ہو جاتی ہے۔ یہ صرف ملازمت ہی کے باعث ممکن ہے کہ عورت مرد کے مساوی سوچے اور عمل کر سکے۔ وہ ایک دفعہ مفلوج کردار سے باہر نکلے تو دوسروں پہ انحصار کرنے کا سارا ڈھانچہ خود بخود نیچے آن گرے گا اور پھر اس کے اور دنیا کے درمیان، مرد

جیسے مصالحت کنندہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

عذاب یہ ہے کہ عورت کو کچھ کرنے نہیں دیا جاتا ہے۔ آخر کو وہ نرگسیت، عشق اور مذہب کے ہیولوں میں خود کو پھنسا کر، سمجھتی ہے کہ مطمئن ہے۔ جب وہ پیداواری قوت بنتی ہے۔ تو وہ خود آگاہ بھی ہوتی ہے، اپنے کردار کو سمجھتی بھی ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتی بھی ہے۔ ستم یہ ہے کہ کام نہ کرنے والی بھی بہت سی عورتیں، اعتماد اور خود کفالت کو نوکری اور اپنی ملازمت کے حوالے سے مستحکم جاننے کے باوجود، کچھ نہ کر سکنے پہ بہت افسوس کرتی ہیں۔ کچھ خواتین اپنے آپ کام کر کے، خود کو بڑی سے بڑی قوت سے ٹکر لے لینے کا اہل سمجھتی ہیں۔ البتہ صرف ووٹ دینے کا حق یا ملازمت، عورت کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار نہیں کر سکتا ہے۔ محض کام کرنا۔ آزادی نہیں ہوتی ہے کہ اب تک سماجی ڈھانچے نے، عورت، مرد کے کرداروں کے بدلنے کے باوجود، تبدیلی کو قبول نہیں کیا ہے۔ یہ دنیا کہ جس میں مرد کی حاکمیت، حاکمیتِ اعلیٰ رہی ہے، وہ اپنی صورت کو برقرار رکھتی ہے۔

ہمیں ان عوامل کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جو عورت کے کام کو مزید پر پیچ بنا دیتے ہیں۔ ایک تجربہ کار اور دانشور خاتون نے فیکٹروں میں کام کرنے والی خواتین کے بارے میں تحقیق کی، ان کی تحقیق کا لبِ لباب یہ ہے کہ عورتیں فیکٹری میں کام کرنے کی بجائے، گھروں پہ رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ ہر چند وہ معاشی آزادی اور مساوات حاصل کرتی ہیں، مگر اُن کی فیکٹری میں نوکری اُن کی حسبِ سابق گھر کی ذمہ داری کو نہ تبدیل کرتی ہے نہ کم کرتی ہے۔ عورتوں کی اکثریت، روایتی نسوانی دنیا سے بھی باہر نہیں آ سکتی ہے کہ وہ تو شوہروں سے نہ معاشرے سے، مساوی درجہ حاصل کر سکتی ہیں اور نہ وہ ماننے کو تیار ہی ہوتے ہیں۔ صرف وہ عورتیں کہ جو جارحانہ رویے اختیار کرتی ہیں۔ یونین میں حصہ لیتی ہیں اور جن کو اپنے مستقبل پر

اعتماد ہوتا ہے۔ صرف وہی خواتین اپنے اس مسلسل کام اور گھر اور فیکٹری کی دوہری ذمہ داری کو اخلاقی معنویت دے سکتی ہیں۔ مگر فرصت نہ ملنے کا بالواسطہ اثر ان پر جاری رہتا ہے۔ عورت حال ہی میں اپنے سیاسی اور معاشرتی احساس کو اجاگر کرنا شروع ہوئی ہے اور اپنے کام کے عوض وہ تمام حیثیت کا صلہ حاصل نہیں کر سکی ہے کہ جو اُسے ملنی چاہئیے۔

یہ بھی درست ہے کہ دوکانوں پہ کام کرنے والی لڑکیاں، سیکرٹری کے طور پر کام کرنے اور دیگر ایسے ہی شعبوں میں متعین لڑکیاں، مرد کی محافظت کا فائدہ اُٹھاتی ہیں کہ بدن کی زکوٰۃ اور جسمانی ضرورت کو لذت میں منتقل کرنا، نوجوان لڑکیوں کیلئے ویسے بھی ایک امتحانی مسئلہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی نوجوان لڑکی کی تنخواہ تو متوسط ہوتی ہے، مگر اس کا معیارِ زندگی، لوگ بہت اعلیٰ توقع کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنی آمدنی کی معقولیت میں رہ کر بود و باش اختیار کرتی ہے تو پھر لوگ اس کے لباس، رہن سہن، کھانے پینے اور محبت اور برتاؤ تک میں تمیز کریں گے۔ اب ہر شخص خدا کو محبوب نہیں مان سکتا ہے۔ اُسے زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مردوں کی ستائش بھی حاصل کرنی ہے۔ وہ اس لئے مدد حاصل کرنے اور یوں اپنے حاکم سے کم تنخواہ پانے کو بھی معقول بات تسلیم کرتی ہے۔ یہ آغاز ممکن ہے اُسے مستقبل میں صحیح آزادی اور مستحکم پیشے اور مستقبل کی جانب گامزن کر سکے۔ یا پھر وہ کام چھوڑ کے، صرف اپنے حاکم کی داشتہ بن کر رہ جائے۔ ممکن ہے وہ آمدنی کی دونوں صورتوں کو قبول کرے کہ یہ اُسے فراوانی دلا سکتی ہیں۔ شادی شدہ عورت کے لئے اس کی آمدنی، گھر میں اضافی آمدنی کے طور پر آتی ہے۔ لڑکی کے لئے یہ آمدنی، شادی کے لئے تیاریوں میں مدد دے سکتی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی صرف اپنی آمدنی پہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہونے کی کوشش نہیں کرتی ہے۔

کچھ خواتین اپنے شعبوں میں معاشی اور سماجی انفرادیت اور استحکام پاتی ہیں -

ہر چند وہ بہت کم تعداد میں ہیں۔ مگر ان کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت چاہے تو سماجی رتبہ پا سکتی ہے۔ یہیں دو نظریئے جنم لیتے ہیں۔ آزادیٔ نسواں اور منفیٔ نسواں طبقہ منفیٔ نسواں اس نظریئے پر اعتماد رکھتا ہے کہ پیشہ ور اور کارکن خواتین اپنے اندرونی عدم توازن سے نالاں رہتی ہیں۔ وہ تو اس حد تک کہتا ہے کہ کارکن خواتین غلط راستے پر گامزن ہیں اور انتشار کا شکار ہیں۔ جو عورت معاشی آزادی حاصل کئے ہوئے ہے۔ وہ مرد سے اخلاقی' سماجی اور نفسیاتی سطحوں پر حائل نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے پیشے میں کس قدر منہمک اور مصروف ہے، یہ تو اُس کی زندگی کے پورے سماجی ڈھانچے پہ منحصر رہتا ہے کہ اس مرحلے سے پیشتر جب وہ لڑکی تھی تو اس کا ماضی ایسے سماجی اور معاشی حالات کا آئینہ دار نہیں تھا۔ اِسی لئے ایک خود مختار عورت کا بطور فرد زندگی بسر کرنا، معاشرے کے لئے ناقابلِ قبول ہونے کے باوجود، ایک اَمرِ واقعہ ہے۔

مرد کے لئے ایک مثبت نقش بچپن ہی سے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جہاں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا ہو کر کیا بنے گا کہ عورت کو تو بس پرائے گھر سدھانے۔ ان کے ساتھ گزر کرنے کا سلیقہ سیکھنے، بننے سنورنے اور مسحوریت کے گُر سیکھنے کے علاوہ، فرد بننے اور اپنی ذات کو اپنے وجود میں محسوس کرنے کا ہنر تو سکھایا ہی نہیں جاتا ہے۔ اب ایک آزاد اور خود مختار خاتون اپنے ماضی اور شعور دونوں کا امتزاج رکھنا چاہتی ہے، وہ معاش میں حصہ بھی لیتی ہے اور بنتی سنورتی بھی ہے۔ ویسے کچھ لوگوں نے تو دانشور خواتین کو یہ نعرہ بھی دیا ہے کہ اگر تم مرد کی برابری کا دعویٰ کرتی ہو تو لپ سٹک اور نیل پالش قسم کے نخرے چھوڑو۔ ہر چند یہ بھی انتہا پسندی ہے کہ فیشن کرنے اور بننے سنورنے کا رویہ مصنوعی ہے تو قطعی ترک کر دینے کا رویہ بھی بالکل مصنوعی ہی ہوگا۔ ہاں اس کے رویوں، لباس پہننے، بولنے، ہنسنے اور مردوں سے ملنے کے رویے میں تبدیلی ایسی واضح ہو سکتی

ہے کہ غیر کارکن عورتیں محسوس کریں، مگر وہ پھر بھی کوئی ایسی بنیادی تبدیلی بہر حال

نہیں ہوگی کہ کارکن عورت کو "ناعورت" سمجھا جا سکے۔ چونکہ منفی رویوں کا انجام بھی مثبت ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نوبالغ لڑکی اگر احتجاجی مظاہروں میں حصّہ لے تو وہ اپنے آپ کو نوبالغ نہیں سمجھے گی۔ اسی طرح کارکن عورت کو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وقت اور موقع کے مطابق کیا پہننا ہے اور جو عورت بلاجواز ظاہر ہونے کا شوق نہیں رکھتی وہ اصول اور ضابطے کے مطابق لباس اختیار کرے گی۔ مگر جہاں اس کی پیشہ ورانہ ضرورت غیر معمولی لباس اور تراش خراش کی خواہاں ہو۔ وہاں یہ شوق نہیں بلکہ ذمّہ داری کا حصّہ بن جاتی ہے۔ مرد، اپنے لباس کے معاملے میں باوقار نظر آنے والی بات تو ملحوظ رکھتے ہیں۔ مگر چونکانے والی بات نہیں کرتے[1]۔ جبکہ عورت کو خیال ہے کہ اس کا حلیہ، اس کی ذات کا لازمی حصّہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے اہم یا غیر اہم ہونے کی دلیل بنتا ہے۔ وہ اگر کسی شہر میں تبدیل ہو کر جائے گی تو کسی چھوٹے موٹے ہوٹل یا جگہ پر نہیں رہ سکتی بلکہ اُسے رہنے کے لئے کسی مناسب مقام کی تلاش ہوگی اور وہ اُسے ذوق کے مطابق شائستہ بھی رکھے گی کہ وہ دوسروں کیلئے ہی نہیں بلکہ خود اپنی ذات کے لئے بھی اپنی نسوانیت کو برقرار رکھنا پسند کرتی ہے کہ اس کی زندگی یعنی بچپن نوجوانی کے حالات اور ارد گرد کے ماحول نے اس کو خود آگاہ اور خود نگر بنا دیا ہے۔ اس کی طبیعت میں عورت پن کی پرورش اُسے نوکری کے باوجود گھر کے فرش صاف کرنے سے کھانا بنانے اور سارے کام خود کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ورنہ وہ ہوٹل میں جا کر بھی کھانا کھا سکتی ہے جیسا کہ عام طور پر اکیلے مرد کرتے ہیں۔ آج کی عورت بطور عورت اور مرد، دونوں طرح رہنا پسند بھی کرتی ہے اور اِسے قابلِ افتخار

---

[1] یہ بھی آج سے ۲۰ برس پہلے کا خیال ہے۔ ہیپی ازم کے بعد، مردوں میں نسوانی انداز لباس اور شوخ نظر آنے کے ساتھ جاذب نظر لگنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔

بھی سمجھتی ہے اگر وہ زیادہ تر نسوانی اثرات قائم رکھنا چاہتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جنسِ مخالف کے لئے کشش قائم رکھنا پسند کرتی ہے کہ اس کے لئے سب سے مشکل مرحلہ جنس ہوتا ہے۔ مکمل فرد ہونے کے ناطے، عورت کو بھی مرد تک اسی طرح رسائی کی قوت حاصل ہونی چاہیئے جیسا کہ مرد کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ شہرت، دولت یا عقل میں بھی انفرادیت برقرار رکھتی ہے تو یہ امر اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی ذہنی افتاد اور استعداد، خواتین ہی میں اور اکثر مردوں میں بھی اس کو تنہائی کا احساس دلاتی ہے کہ اس کے ذہن اور استعداد سے اوسط درجے کے گرد اگرد لوگ خوف بھی کھاتے ہیں اور پریشان بھی ہوتے ہیں۔ یہی خوف، خود اس کو ذہنی طور پر صلاحیت نہ دکھانے پہ مجبور کرتا ہے کہ جس طرح بہت سی عورتیں، عمر چھپاتی ہیں۔ وہ عقلمندی کو چھپاتی پھرتی ہے۔ وہ اس مشقت کے تشنج میں گرفتار ہو جاتی ہے، وہ اوسط درجے کی بیوی اور محبوبہ کی طرح شوہر یا دوست کو فریفتہ کرنا اور تعریف کرنا بھی نہیں جانتی۔ مگر جب اپنی شکست کا منظر نامہ اپنے ہی سامنے تحریر ہوتے دیکھتی ہے تو پھر وہ مردوں کے ہتھیاروں سے ان پر حملہ آور ہوتی ہے۔ وہ سننے کی بجائے محض بولنے پہ اکتفا کرتی ہے۔ وہ اپنے عجیب و غریب جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ وہ مردوں سے کسی بات پر متفق ہونے کی بجائے، ان سے اختلاف کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے رویئے، مرد کو فریفتہ نہیں کرتے، بلکہ عورت سے بیزار کرتے ہیں کہ ان کی تربیت، ایک غلام اور محکوم سے محبت کرنے کی تو ہوئی ہوتی ہے۔ ایک فرد کے ساتھ محبت کرنے کی نہیں ہوتی ہے۔ ایک ذہین خاتون کے بجائے، شرمائی لجائی خاتون، ان کیلئے زیادہ جاذب نظر ٹھہرتی ہے۔

اس کے باوجود، مرد، عورت کی بدلتی شکل پہ ابھی متحیر ہیں اور عورت نے مرد

ہر چند، توازن کی منزل ابھی بہت دور ہے، مگر ساری مشکلات عورت کے لئے ہیں، مرد کے لئے نہیں۔ ویسے تو گھر بیٹھنے والی عورت کے لئے بھی مسائل اور بیزاری کی منتہائیں، کچھ کم نہیں۔ کارکن عورت، لڑ کر ان مسائل کو حل کرنا چاہتی ہے۔ جبکہ گھر بیٹھنے والی نے ان پر سوچنا ہی بند کر دیا ہے کہ سارے مسائل کا حل اس کی موت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے لڑنے والی عورت، زندہ در گور عورت سے خود کو بہتر حالت میں متصور کرتی ہے۔ ہاں مرد کے مقابلے میں اُسے کئی ناکامیوں کا بہر حال سامنا کرنا پڑتا ہے۔

وہ خاتون جو اپنی قوتوں کے پھیلاؤ پہ قدرت رکھتی ہے۔ اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہے۔ جو زندگی میں اسی قدر یا اس سے بھی زیادہ محنت کرتی ہے۔ جتنی کہ مرد کرتا ہے۔ اُسے دنیا کے نہ چاہتے ہوئے بھی، اتنے ہی آرام، ذہنی تفریح اور جنسی تبدیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے، جتنی کہ کسی مرد کو۔ کئی ایسے مراحل ہیں کہ جن میں عورت کی اس آزادی کو تسلیم کرنے سے ماتھوں پر شکنیں آجاتی ہیں کہ اگر وہ یوں کرتی بھی ہے تو اس کی شہرت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی لئے منافقانہ اور متضاد رویئے اختیار کرنے پر آخر کو وہ بھی مجبور ہو جاتی ہے۔ البتہ جیسے جیسے کوئی عورت معاشرے میں اپنا مقام بناتی چلی جاتی ہے۔ ویسے ویسے اس کی خامیوں پر دنیا پردہ بھی ڈالتی چلی جاتی ہے۔ البتہ چھوٹے شہروں میں تو آپ عجیب الخلقت بہر حال ہی میں رہیں گی چاہے صرف کالج میں پڑھنے کی روایت کا آغاز کیا ہو۔ جہاں یہ صورت نہ ہو۔ وہاں مساوی درجے کے کام اور ذمہ داریوں کے باوجود، سماجی ڈھانچہ، عورت اور مرد، دونوں کو مساوی سطح پر نہیں رکھتا۔

اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ جب جی چاہے اور جہاں جی چاہے۔ گھنٹے ڈو گھنٹے کے لئے مرد ساتھی تلاش کیا اور مقصد ختم۔ مگر یہ بدنامی تو مغرب کی عورت کو قبول نہیں کجا مشرق کی عورت کہ جو شوہر کے ظلم بھی ہنس کر برداشت کرنے کو عبادت سمجھتی ہے اور ایسے رویے تو مغرب میں بھی خطرناک ہوتے ہیں کہ اول تو نسوانی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ پھر حمل ٹھہرنے کا خدشہ بھی عورت کو ہوتا ہے۔ مرد تو گھوڑے کی طرح فارغ ہو جاتا ہے۔ ایک مرد جو عورت، کرائے پر لے کر جاتا ہے۔ وہ تو گھر میں حفاظت کا انتظام دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے، مگر عورت، مرد کو اس طرح گھر نہیں لے جا سکتی ہے کہ پیرس ہی میں ایسی عورتوں کے ساتھ یہ ہوا کہ مردوں نے جنسی فعل کے بعد، عورتوں کو مارا پیٹا، سارا سامان لوٹا اور چمپت ہو گئے۔ ہمیشہ کے لئے مرد ساتھی رکھنا، گویا معاشی طور پر ایک فرد کو بطور محبوب پالنے کے مترادف ہے (پیرس میں) اور بہت سی عورتیں ایسا کر بھی لیتی ہیں۔

عمومی طور پر یہ صرف جنس کا معاملہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ خواہش اور انسانی نفس کی عزت بحال رکھنے کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جہاں عورت، جنس کے معاملے میں بھی مرد سے بڑھ کر تیزی اور پیش رفت دکھائے، تو مرد، اپنی جنسی صلاحیت پوری طرح بروئے کار نہیں لا سکتا ہے، یہ تو اسی وقت ممکن ہے کہ جب اُسے پتہ ہو کہ وہ عورت کو تسخیر کرنے اور اپنی مردانگی کا قائل کرنے جا رہا ہے۔ وہ عورت کو پھول کی طرح توڑے، مسلے، پھل کی طرح چکھے اور گھاس کی طرح روندے، تبھی وہ پورا مرد، خود کو سمجھتا ہے۔ ورنہ کہا جاتا ہے کہ عورت کے رحم میں شیطان ہے اور اس کے اندر ناگ پھن اُٹھائے بیٹھا ہے کہ مرد کے افزونِ پیدائش کے جراثیم کھا جائے گا۔ عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مرد کے سامنے رو کر، گڑگڑا کر اور رحم طلب نظروں سے، جنسی فعل ختم کرنے کی التجا کرے۔ جو عورتیں جنسی شہوت میں پہل کرنے کی خواہشمند ہوتی

طرح لذت اندوز ہو سکتی ہیں۔ وہ عورت جو مرد کی برتری کو قبول نہیں کرتی، مرد اس کے ساتھ ہم بستری اس کے برتر ہونے کے ناطے نہیں کرتا، بلکہ اس خیال سے کرتا ہے کہ وہ جو دنیا کے لئے ناقابلِ تسخیر تھی۔ وہ اس وقت اس کے قبضے میں ہے۔

اگر عورت، مرد، دونوں بااعتماد اور صحت مند ذہن کے لوگ ہوں تو یہ باہمی بے اعتمادی اور خلفشار دور ہو جاتا ہے اور باہمی اعتماد محبت کی سبیل بنتا ہے۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ جو عورت، کسی قابل نہیں مگر کسی قابل بننا چاہتی ہے۔ اس کا شوہر یا دوست اس کی خواہش پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کے نام سے مضمون چھپواتا ہے۔ تقریریں لکھتا ہے۔ ناول لکھتا ہے، البتہ جو اس قابل ہو اور ان کی نگہداشت کی مرہونِ منت نہ ہو، وہ مرد کو ناقابلِ برداشت معلوم ہوتی ہے اور تیس سال کی عمر کے بعد، عورت کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ مرد، مساوی درجے پہ قبول کرتا ہوا ہو؟ ورنہ مرد کی برتری تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے۔

یہ واضح ہے کہ مرد عورت کو خالی برتن کی طرح اٹھاتا ہے۔ پھر اپنی تمنا اور سوچ کے مطابق اس کو بھر کر اپنی اشتہا کو پورا کرتا ہے۔ یوں مرد کے اس تجسس اور اپنے ہاتھوں عورت کی شناخت کرنے پر، جیسے ایک مالی، پھل کو پہچان لیتا ہے، وہ مطمئن بھی ہوتی ہے اور خوش بھی۔ ایک اور صورتِ حال میں وہ غیر مانوس قوتوں کے ہاتھوں میں متصور کی جاتی ہے۔

اس کے اندر ایک سانپ لہرا رہا ہوتا ہے کہ جو مرد کے جوہر مردمی کے لئے پیاسا ہوتا ہے۔ عورت کو آزاد اور منفرد حیثیت میں تسلیم کرنے کی تسلیمیت تو نظر ہی نہیں آتی ہے۔ فرانس میں آزاد عورت اور ہلکی عورت، دونوں استعاروں کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ ہلکی عورت سے مراد وہ عورت ہے کہ جسے مدافعت اور اجتناب کے کلیوں سے

واقفیت نہیں ہوتی ہے اور جو آزادی کی اوّلین بنیاد ہی کی خلاف ورزی کر رہی ہوتی ہے۔ عورتوں کا ادب اس استغاثے اور اس قسم کی عورت کے خلاف ہے۔ کلارا مالروکس اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ اس کی ہیروئن، محض دکھاوے پہ اعتماد نہیں کرتی ہے بلکہ وہ اپنے تیقن کے ساتھ قدم اُٹھاتی ہے۔ امریکہ میں عورت کی جنسی زندگی میں ایک خاص حد تک آزادی کا یقین کیا گیا ہے۔ مگر فرانس میں کسی قسم کی آزادی کو بھی حرفِ غلط سمجھا جاتا ہے کہ اگر اس کی اجازت دی بھی گئی تو بہت احتجاج ہو گا۔ اگر عورت بے بنیاد افواہوں کو تحقیر کی نظر سے دیکھے بھی، تب بھی اس کے اپنے ساتھی کے لئے یہ خاصی نفسیاتی تشنج کی بات ہو گی کہ وہ عورت کو اپنی حدود کی لامحدودیت تک عورت یہ اپنا حق رکھنا اور جتانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت کا مقدر ہر رنگ اور ہر روپ میں اس کے سامنے شکست ہونا ہو اور اس کے لفظ آنسوؤں کی شکل میں ٹپکیں اور وہ ہر لمحہ اپنے ماتحت ہونے اور مرد کے حوالے سے لطف کا افسانہ کہے۔

اگر وہ مغرور اور طلب کرنے والی خاتون ہے اور مرد کو کمتر سمجھ کر ملتی ہے اور بے توجہی بھی برتتی ہے، حالانکہ وہ مرد سے کم قوت ہے۔ اپنی قوتِ فیصلہ کم منطبق کر سکتی ہے۔ مرد کے لئے یہ تناؤ اور سرگرمی، باعثِ انگیخت ہوتی ہے اور عورت کے لئے یہی تناؤ، ہر قسم کی لذتیت کو فنا کرنے کا حربہ بھی بن سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جو عورتیں اپنی انفرادیت اور احساسِ تفاخر کو برقرار رکھتی ہیں۔ وہ یخ بستگی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ بہت کم ایسے عاشق ہوتے ہیں۔ جو کہ عورت کی حاکمیت اور ایذا رسانی کی کیفیات کو برداشت کر سکیں اور اس سے بھی کم ایسی خواتین ہیں کہ جو مردوں کے سیدھے پن سے عشقیہ لذت کشید کر سکیں۔

البتہ عورتوں کے لئے ایک کم نقصان دہ راستہ ہے اور وہ ہے خود اذیتی سے لطف اندوز ہونا۔ جب کوئی شخص سارا دن کام کرے، ساری ذمہ داریاں اور

اندیشوں کو بھی اپنے ذمے رکھے تو رات کو خود فراموشی کے عالم میں، خود اذیتی کو لذت میں تبدیل کرنے کا ہنر، عورت ہی جانتی ہے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مرد کی حاکمیت کے سامنے سربہ زانو ہو جاتی ہے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ اگر عورت، مرد کی حاکمیت کو محسوس کرتی اور مانتی ہو۔ جو عورت، مردوں کے درمیان روزی کماتی اور زندگی گزارتی ہو۔ اس کے لئے ایسا سوچنا اور کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مجھے ایک خاتون کا قصہ معلوم ہے کہ جو اذیت پرست تو نہ تھی۔ البتہ، مگر مزاجاً نسوانیت کا پیکر تھی۔ یعنی جو مرد کی بانہوں ہی میں زندگی کی مسرت کی انتہا محسوس کرتی تھی۔ اس کی کتنی ہی شادیاں ہوئیں اور شادیوں کا سلسلہ سترہ سال کی عمر سے شروع ہوا اور اس کی ہر شادی بقول اس کے جب تک رہی، کامیاب رہی۔ ہوتا یہ تھا کہ شادی کی کامیابی کے تسلسل سے گھبرا کر وہ کہتی تھی کہ میں بے حس اور یخ ہو رہی ہوں۔ یعنی وہ اس مرد پر حکم چلانے کو عام روزمرہ سمجھ کر ذائقہ بدلنا چاہتی تھی۔

یہ تلازمہ ایک اور روزن کھولتا ہے اور وہ یہ کہ جب مرد کی حاکمیت کو، عورت شک کی نظر سے دیکھنے لگے تو بستر میں خاص کر، مرد اپنی مردانگی کا وحشیانہ مظاہرہ شعوری اور غیر شعوری طور پر کرتا ہے اور عورت جان بوجھ کر اس وقت آنکھیں بند کر لیتی ہے یہ محض خود پرستی کی بنا پر نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ تجربہ، خود اذیتی اور ایسے سارے عوامل مل کر اس کو اس سارے عمل میں شریک کرنے کی بجائے تماشائی بنا دیتے ہیں۔ مگر پھر وہ ظاہر یہی کرتی ہے کہ وہ جانتی ہے، پہچانتی ہے اور شریکِ سفر بھی ہے کہ وہ خود کو باور کراتی ہے کہ مرد، اس پر حاکمیت رکھتا ہے۔ یا پھر وہ ایسے مرد کی تلاش میں نکل جائے گی کہ جو واقعی اس پر حاکمیت حاصل کرنے کا اہل ہو یا پھر وہ یخ ہو جائے گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اگر دو افراد، ایک دوسرے کی حیثیت کا احترام کریں۔ تو خود اذیتی اور خود رحمی کے احساسات مندمل ہو سکتے ہیں اور محبت بہتے دریا کی طرح

موجزن ہو سکتی ہے۔ مگر یہ بات مرد کے مقابلے میں، عورت کے لئے کافی مشکل ہے کہ وہ مرد کو مساوی درجہ دے کر قبول کرے کہ مرد تو اپنے سے بہتر عورت پر بھی عشق کی کمند پھینک کر، اپنی کامیابی کا راستہ تلاش کر سکتا ہے۔ عورت اپنے محبوب کو اِن دائروں اور حلقوں میں متعارف کروائے گی۔ جن سے مرد نا آشنا تھا اور مرد کو اِس نئے ماحول میں لُطف بھی آئے گا۔ وہ عورت کچھ وقت کے لئے تو مرد کو مسحور کرتی اور دلچسپ محسوس ہوتی ہے۔ عشق کے اوائل کے باعث عورت کی خوبیاں، گستاخیاں، سب منفرد باتیں اور قابلِ معافی صورتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اگر عورت بہت ذہین، جرأت مند اور واضح نقطۂ نظر کی نہ ہو تو مرد اس پر الزام نہیں رکھتا، بلکہ کہتا ہے کہ وہ تو جانتی ہی نہیں۔ بلکہ اس کو کچھ بنانے اور کسی مقام تک لے جانے کا سوچتا اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش بھی کرتا ہے اور عورت کا یوں مرد کی توجہ حاصل کرنے کا عمل، مرد میں دلچسپی اور محبت کو اجاگر بھی کرتا ہے۔ مرد چاہتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے، اس کے وعدوں اور غیر یقینی کیفیتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اس کے خیالات اور برتاؤ کو اہمیت دیتے ہوئے۔ عورت مرد کے رویّوں کی توثیق اور اثبات کرے تب ہی وہ اس کی محبت کا قائل ہوتا ہے۔ مرد عورت کے لئے زمین پہ کوئی جنت تخلیق نہیں کرتا ہے۔ عورت بھی مرد کی طرح اسی زمین پہ رہتی اور پرورش پاتی اور پھر مرد سے ملتی ہے۔ مگر مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ بولے تو سننے والی اس کی بیوی ہو۔ جو وہ بولے اس پر اعتبار کرنے والی اس کی بیوی ہو۔ وہ اپنے آپ کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اگر وہ دلچسپ گفتگو نہیں کر سکتا تو وہ بیوی کو بور کرتا ہے، عورت کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ نوجوان آدمی اور بہت ہی کم عمر نوجوان مسحور کن وعدے اور امکانات کے دعوے کر سکتے ہیں۔ عورت تیس سال کی ہو جائے تو اُسے کم عمر نوجوان، فوراً آنٹی اور خالہ کے خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر عورت کسی نوجوان کے کہ جو اس سے کم عمر ہو۔ پیچھے پڑے اور شب بسری کرنا

چاہے تو اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عورت کی بڑی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے وہ مرد، اپنی حاکمیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عمومی عورت نہ ایسا رویہ اختیار کرتی ہے اور نہ وہ مرد کی حاکمیت کے بارے میں کوئی اشتباہ اپنے ذہن میں رکھتی ہے۔ بلکہ وہ تو مرد سے زیادہ سوال کرتی ہی نہیں ہے۔ مگر وہ جو سوال نہیں کرتی وہ سوالوں کو اپنے اندر نامرادیوں کی طرح دفن بھی کرتی ہے۔ مرد، عورت سے سوال کرے یا نہ کرے۔ جسمانی تلذذ اور جنسی لطف تو عورت سے حاصل کر ہی لیتا ہے۔ جبکہ عورت ممکن ہے پورے عمل میں شریک ہی نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو مرد کے سامنے پیش کر کے اور بغیر چون و چرا سب کچھ تسلیم کر کے، اس مسئلے کے بعد، آرام سے سونا چاہتی ہو۔ مرد سمجھتا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے اور کام ختم کرنے کا عورت سوچتی ہے۔ اگر عورت کو لطف آ رہا ہو تو وہ پھر اس عمل کو طول دیتی ہے۔ عمل کے دوران یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے مرد، اپنی سابقہ معشوقاؤں اور ان کے ساتھ جنسی روابط کا ذکر کر کے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں، جبکہ عورت اگر کسی کا نام بھی لے دے تو فوراً غصے سے تیوریاں بدل کر یہ سوال منہ پر آتا ہے کہ اس وقت تمہیں کسی کا نام یاد کیوں اور کیسے آ گیا۔

عورت کا مخصوص جنسی رجحان جو کہ آزادی پسند خاتون کو یک زوجگی میں مقید کرتا ہے۔ ایسے رابطہ یا شادی میں مرد کے مقابلے میں عورت کو زیادہ آسانی سے مفاہمت کر لیتی ہے۔ کبھی اس کا شوہر یا محبوب، اس تعلق کو ختم کرنے کے لئے کہتا ہے۔ مگر وہ کتراتی ہے کولیٹ کے ویگا لونڈ کی طرح کہ جو شادی سے تو خوفزدہ ہے، مگر مرد کے وجود اور موجودگی کو تحفظ کی ضمانت سمجھتی ہے۔ اگر وہ پالیتی ہے اور تسلیم کرتی ہے تو وہ مکمل وجود ہے۔ اگر وہ انکار کرتی ہے تو خود کو تنہائی کے صحرا میں فراموش کر دیتی ہے۔ آج کل ایک مرد چاہتا ہے کہ اس کی ساتھی دوست اپنا

کام یعنی نوکری جاری رکھے۔ آج کولیٹ کے ہیرو ئن[1] کہ جو میاں کی خوشنودی کے لئے نوکری چھوڑ دیتی تھی، مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ دو آزاد افراد کے لئے اکٹھے رہنا، قابلِ قبول اور صلح پسند عمل ہے اور دونوں ساتھ رہ کر بھی اپنی آزادی کی ضمانت کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ معاشی طور پر خود کفیل خاتون، اپنے شوہر کو بھی آزادی کی نئی راہیں دکھاتی ہے۔ اگر مرد بھی شعوری پختگی حاصل کئے ہوئے ہو تو پھر یہ جوڑا، باہمی اور مساوی عزت و احترام میں گندھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ مرد، بہت ہی دل و جان نچھاور کرنے والے کی حیثیت سے اپنی ساتھی اور بیوی کی خدمت کر کے خوشی حاصل کرتا ہے۔ ایلیٹ کے لئے، لوئس نے وہ ماحول پیدا کیا تھا کہ جو بیوی اپنے بڑے رئیس شوہر کیلئے آراستہ کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ گھر کی پُرسکون اور ہموار فضا کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری عورت پر عائد ہوتی ہے۔

مرد کے لئے یہ ایک عمومی اور قدرتی بات ہے کہ گھر اور بچوں کی نگہداشت، عورت کے سپرد ہو۔ خود کفیل عورت بھی یہ متصور کرتی ہے کہ دفتر کی ذمہ داریاں، اس کو گھریلو ذمہ داریوں سے الگ یا مبرا نہیں کرتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کو یہ باور بھی نہیں کروانا چاہتی ہیں کہ اگر وہ عام یا گھریلو عورت سے شادی کرتا، تو ان کی زندگی کا یہ رویہ اور منظرنامہ کچھ اور طرح کا ہوتا۔ وہ بیک وقت محفل کے شعور، باورچی خانے کے سلیقے، پیار کرنے والی ماں اور روایتی گھر والی کا کردار اپنے اندر سمو کر اپنے آپ کو پھیلاتی اور سمیٹتی ہیں۔ یہ مجموعی کارکردگی، اپنے ساتھی کو خوش اور مطمئن کرتے اور اپنے کام کو سنجیدہ عمل ظاہر کرنے کے لئے خاتون اپنے ذمے لیتی ہے۔ یعنی وہ اپنے شوہر جیسی اور بیک وقت بیوی جیسی، صلاحیتوں کا برملا مظاہرہ کرتی ہے۔ چونکہ اس کی تربیت ایسے ماحول میں

---

[1] پاکستان میں آج بھی یہ واقعہ ہے اور یونہی ہوتا ہے۔

ہوئی ہوتی ہے کہ جہاں مرد کے احترام کو روایت کے طور پر اپنایا گیا ہوتا ہے۔ کام کرنے والی عورت بھی سمجھتی ہے کہ اوّل احترام اور پوزیشن تو مرد کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ کبھی وہ محسوس کرتی ہے کہ اگر وہ یوں مرد کو برتر نہ مانے گی۔ تو پھر وہ اپنا گھر تباہ نہ کر لے۔ یعنی ایسی عورت اپنے وجود کے دباؤ اور اعلان کی گھاٹی پہ کھڑی، دو تصورات کے درمیان لٹکتی ہوئی ہوتی ہے۔ ہاں ایک فائدہ ہے کہ جو عورت معاشرے میں اپنے کم تر ہونے کے حوالے سے حاصل کر سکتی ہے۔ چونکہ وہ شروع ہی مقدر کے کھوٹے ہونے سے کرتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی ناکامیوں اور پسپائیوں کو اُسی تسلسل کا حصہ سمجھتی ہے۔ خود کفیل عورتوں میں سے بہت کم اس نظریئے کی خواتین ہوتی ہیں۔ جو اپنے ساتھی کے ساتھ، آزادانہ تعلق قائم کر سکیں، بلکہ وہ بھی مرد کی جانب، محبت کے اعلان کے لئے، منتظر نگاہوں سے تکتی رہتی ہیں۔

ہر چند ۲۰ سال کے انتظار، محنت، خواب دیکھنے اور اُمیدوں کے بعد آزادی کا ہیولا، کس پیکر میں بدل سکا ہے۔ اب بھی جب تک لڑکی کو لڑکوں کی طرح آزادانہ پروان نہیں چڑھایا جاتا، اس وقت تک وہ نرگسیت کے حصار میں مقید، کوتاہ بیں ہی رہے گی۔ کارکن عورت اپنے دفتری تجربوں کو، اپنے تصوّرات اور خیالات کو وسیع بنانے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ لیکن اگر مرد اُن کی نفی کرتا ہے تو وہ اپنے خیالات سے کنارہ کش بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ آزادی اختیار کرنے سے زیادہ آزادی ملنے کی منتظر رہتی ہے، تو معاشرے کے لئے قابلِ قبول قرار پاتی ہے۔ ایسے ہی حالات میں کبھی کبھی تو وہ اپنی آزادی بالکل قربان کر دیتی ہے۔ کسی دیوتا سے خدمات کرا لینا آسان ہوتا ہے بہ نسبت اپنی ہی کوششوں کے۔ دنیا اس کو، سر جھکا کر، خود کو تسلیم کروانے کی جانب زیادہ راغب کرتی ہے اور وہ اسی کلیہ کو قبول بھی کرتی ہے۔

عورت اگر اپنے پیشے میں ناکامی کا منہ دیکھتی ہے تو وہ محبت میں پناہ تلاش

کرتی ہے۔ تب اس کی فرسٹریشن، محبوب سے مطالبات اور خواہشات کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اس کی یہ ابتدائی تکالیف، غیرارادی طور پر اس کی پیشہ ورانہ رغبتوں کو بھی بڑھادیتی ہیں۔ ایک عورت کہ جس نے عورتوں کے ایک سیاسی رسالے میں کام کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ دفتر میں وہ کارکن، سیاست پہ کم اور محبت پہ زیادہ باتیں کیا کرتی تھیں۔ اس نے یہ بھی شکایت کی کہ اس کے ذہنی خزینے کی بجائے اس کے بدن سے لوگ محبت کرتے ہیں، جبکہ ایک اور عورت نے کہا کہ اس کے خوبصورت بدن کے مقابلے میں، اس کے ذہن کی تعریف کی جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق اور پیشہ ورانہ زندگی، دونوں صورتوں میں عورت اور مرد کو مساوی سطح پر لیا جائے، اگر مرد کا جسم اچھا ہے تو اس کی بھی تعریف ہو اسی طرح عورت کی بھی مگر حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔

عورت کا ایک عمل کہ جو محض نسوانیت یا خاتون بطور فرد ہونے کے اکیلے ادا نہیں کر سکتی ہے۔ یہ زچگی[1] ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور چند ترقی یافتہ ممالک میں 'عورت بے تحاشہ زچگی سے اجتناب اختیار کر سکتی ہے کہ وہ مانع حمل ادویات گولیاں یا انجکشن استعمال کر لیتی ہے۔ فرانس میں اسقاط کروانا پڑتا ہے اور اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے کہ جو اس کی پیشہ ورانہ زندگی کو تباہ کر سکتی ہے کہ ہماری دنیا کے رواج، عورت کو اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ ناجائز بچے کی ماں، معاشرے کے لئے سکینڈل کا نشانہ ہوتی ہے۔ یہ بہت ہی کم ممکن ہے کہ عورت شادی یا ذات کے چکر سے نکلے بغیر، بچہ پیدا کرے اور

---

[1] اب اس کا بھی حل نکل آیا ہے اور ٹسٹ ٹیوب بے بی اس کی مثال ہیں۔ مگر پھر مرد کا مادۂ تولید تو بہرحال بھی چاہیئے ہوتا ہیں۔

تسلیم کرلی جائے۔ اگر کچھ عورتیں مصنوعی حمل کاری کو قبول کرتی ہیں تو وہ اس لئے کہ وہ مرد کے ساتھ براہِ راست رابطے کو تسلیم نہیں کرنا چاہتیں۔ یہ بھی درست ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم تک کے زمانے میں، عورت کی مصروفیات قطعی ختم ہو جاتی ہیں اور وہ قطعی طور پر بچے کے لئے مختص ہو کے رہ جاتی ہے۔ کام پہ وہ اُسی وقت جا سکتی ہے۔ جب وہ بچے کو کسی رشتہ دار یا دوست کے گھر چھوڑ کر جائے۔ اسی لئے یا تو وہ بچے دانی بند کرواتی ہے یا پھر ساری مجبوریوں کے ساتھ نوکری کرنے اور بچے کی پرورش کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اسی لئے آج کی کارکن عورت ان دو رشتوں اور ذمہ داریوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے اور دونوں میں توازن قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف کہ اگر وہ توازن میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ اس پر انتہائی اعصابی دباؤ ڈالتے ہیں۔ عورت کی کارکردگی کو ناکام ثابت کرنے کے لئے ان کے ماہواری کے زمانے کو بطور شہادت اور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ کارکن عورت نے اس شہادت کو باطل قرار دے دیا ہے کہ کھلاڑی اور کارکن عورتیں اسے بھی عمومی ذمہ داریوں اور صعوبتوں کے ضمن میں قرار دیتی ہیں۔ البتہ کچھ عورتوں کو واقعی اتنی درد اور تکلیف ہوتی ہے کہ وہ چوبیس چوبیس گھنٹے بستر سے نہیں اٹھ سکتی ہیں مگر پھر بھی وہ اس تکلیف کو اپنی کوشش اور مساعی پر حاوی نہیں آنے دیتی ہیں۔

عورتوں کی زیادہ تر بیماریاں نفسیاتی ہوتی ہیں۔ یہ بات زچگی کے ماہرین نے بتائی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی زیادہ تر بیماریاں خیالی اور تصوراتی ہوتی ہیں۔ بلکہ تجربے میں یہ آیا ہے کہ نفسیاتی مریض خواتین اگر کام میں لگ جائیں تو بہت سی بیماریاں خود بخود فرو ہو جاتی ہیں۔

عورت، کام کرنے کے لئے انتہائی جذباتی، سماجی اور انسانی ہیجان کا مقابلہ کرتے ہوئے، سامنے آتی ہے۔ شروع شروع میں تو وہ بہت سخت احساسِ کمتری میں

مبتلا رہتی ہے اور اٹھارہ سال سے تیس سال کی عمر تک اسے ہیجانی معاملات کم و بیش جاری رہتے ہیں۔ اس دوران اور اس کے بعد بھی یہ خصوصی طور پر ہوتا ہے کہ کارکن عورت چاہے اکیلی یعنی شادی شدہ ہو یا مشترکہ خاندان میں رہتی ہو۔ وہ کام کرنے والے مرد کے مقابلے میں وہ عزت نہیں پاتی ہے جو مرد کو ملتی ہے۔ بلکہ کام کرنے والی ہونے کا طعنہ دے کر وہ عورت پر اور بھی ذمہ داریاں ڈال دیتے ہیں۔ گویا ماضی حال اور مستقبل تینوں فصیلوں پر لڑنے کے لئے، عورت کو تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ کبھی فلرٹ کرتی ہے۔ کبھی شادی، کبھی اذیت پرست اور کبھی اذیت دہ، وہ خود کو سوالوں میں اُلجھاتی ہے، احتجاج کرتی ہے اور اپنے آپ کو بکھیر دیتی ہے۔ جتنا جتنا وہ گھر کے کام چھوڑتی جاتی ہے۔ اتنی ہی اس کی طبیعت اُکتاتی جاتی ہے۔

عورت کے لئے جو چیز سب سے زیادہ پریشان کن ہوتی ہے۔ وہ دوسری عورتوں کا آرام سے زندگی گزارنا اور اور بغیر کمائے، ان سے بہتر آسائشِ زندگی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مرد کے کام میں ایسے مراحل نہیں آتے ہیں۔ کارکن عورت اگر کسی خوشحال اور مطمئن جوڑے کو دیکھتی ہے تو اسے خیال آتا ہے کہ کیا وہ تو غلط راستے پر نہیں چل رہی ہے کہ اس قدر مشکلات اس کے سامنے ہیں۔ ایک غریب لڑکی نے ایک دفعہ مجھے کہا کہ "جب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ مجھے سب کچھ خود اپنے دماغ سے سوچ کر کرنا پڑے گا۔ جبکہ مرد اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور عورت کو اپنے ارادے کو ہر وقت مضبوط رکھنا پڑتا ہے۔ عورت کو آگے بڑھتے ہوئے، تمام تر ماحول، عوامل اور منزل گویا ہر چیز پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ ذہنی بیدار خاتون، مردوں کے لئے خود کو ناقابلِ توجہ بنا کر اپنے شوہر یا دوست، دونوں کو ذہنی رنج پہنچائے گی، تاکہ ان کے دخل کے بغیر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ بننے سنورنے اور نہ بننے سنورنے کے دونوں متضاد خیالات اس کی پڑھائی اور پیشے کے انتخاب میں رکاوٹ بھی بن سکتے ہیں۔

عورت اگر محض عورت رہنا چاہے تو وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے اور یوں وہ پیشہ ورانہ مطمع نظر کے بارے میں بھی شک میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ چودہ سالہ لڑکیاں عام مفروضے کا جواب یہ دیتی ہیں کہ لڑکے، لڑکیوں سے بہتر ہوتے ہیں، بہتر کارکن ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑکی کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صلاحیتیں کمتر ہیں کہ استاد اور والدین ان کو بچپن ہی سے باور کراتے ہیں کہ لڑکے کی صلاحیتیں زیادہ اور لڑکی کی کم ہوتی ہیں۔ فرانس میں لڑکیوں کا معیارِ تعلیم لڑکوں سے کمتر ہوتا بھی ہے کہ زیادہ تر فرانسیسی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کے بارے میں، سنجیدہ نہیں ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ پڑھائی کو بھی انتہائی غیر سنجیدگی سے لیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مستقل مزاجی اور محنت ہی آپ کو کسی منزل پہ پہنچا سکتے ہیں۔ فرانسیسی لڑکیوں کی غیر سنجیدگی تعلیم کی سمت اس طرح نظر آتی ہے کہ استادوں کے بقول جو کورس لڑکوں کے لئے مشکل نہ ہو، لڑکیاں اُسے بہت مشکل سمجھتی ہیں۔ جو کتاب لڑکے ایک سال میں پڑھتے ہیں۔ لڑکیاں چار سال میں مکمل کرتی ہیں۔ سبب عقلمندی کی کمی نہیں بلکہ احساسِ شکست اور کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ بقول ایک لڑکی کہ اگر مجھے بھی لڑکوں کی طرح درخت پر چڑھنے کی اجازت اور کُھلی آزادی ہوتی، تو مجھے احساسِ کمتری نہ ہوتا اور مجھے اپنی کمر کے ٹوٹ جانے کا خطرہ نہ ہوتا۔

خود مختار عورت اسی بات سے پریشان رہتی ہے کہ لوگ اس کے کام میں اعتماد نہیں رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اُونچی ذات کے لوگ، نیچی ذات کے ہم عصروں اور ہم پیشہ لوگوں کو برابری کا درجہ نہیں دیتے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ عورت اور مرد، دونوں ہی مگر خصوصی طور پر مرد، عورت کے ماتحت کام کرنا نہیں چاہتے ہیں اور یہ حکم نہ ماننے کا احساس عورت کو مدافعانہ حاکمیت کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ مثال کے طور پر خاتون ڈاکٹر یا تو اپنی حاکمیت سے بہت خود آگاہ ہوتی ہیں یا بالکل لاپرواہ، جو مریض حکمرانی

کے عادی ہوں ۔ وہ طبیعت کی نرمی اور لاپرواہی کو کمزوری پر محمول سمجھتے ہیں۔ جبکہ مرد کی حاکمیت اور جبریت کے بنیادی کلیئے پر اعتقاد رکھنے والے نرمی سے پیش آنے والے ڈاکٹروں کو بہت رحمدل سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح انتظامیہ میں اگر خاتون، مختصر بات، جلدی فیصلہ اور برہمی زیادہ دکھانے والی ہو تو زیادہ پُراثر اور موثر افسر سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس کی کارکردگی، چیلنج اور مستقل مزاجی کے مسلسل امتحان کا دورانیہ ہوتا ہے۔ گویا عورت کو یہ فراموش نہیں کرنے دیا جاتا ہے کہ تم عورت ہو ویسے بھی بہت کم خواتین نوکری یا پیشے کو اس میں اعلیٰ درجے کی انفرادیت اور صلاحیتوں کے ظہور کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ ویسے تو مردوں کی اکثریت بھی کسی قسم کی انفرادیت یا صلاحیت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ یہ مفروضے ایک قسم کی خواتین پر اثرانداز نہیں ہوتے ہیں اور وہ خواتین ہوتی ہیں فنکار، یہ عورتیں بھی اپنا زیادہ وقت مردوں کی معیت ہی میں گزارتی ہیں۔ مگر مرد کے زیرِ اثر نہیں۔ مگر نرگسیت کے اس بحرِ بیکراں میں کہ جہاں وہ اپنے لباس و آرائش سے لے کر خود پرستی میں غوطہ زن رہتی ہیں ۔ ویسے بھی فنکار کو رسوم و رواج اور پابندیوں کے مقابلے میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا جنون زیادہ رہتا ہے ۔ یہی جنون نرگسیت اور خود پرستی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ فنکارانہ جنون، ایک بہتر شوہر، اچھا گھر اور ماحول حاصل کرنے کے بعد، سرد پڑ جاتا ہے یا کردا دیا جاتا ہے یا وہ خود اپنی ذات کے حصار سے نکلنے کے قابل نہیں رہتی ہے اور وہ بجائے اپنی ذات کو فنکارانہ ارتقا میں تلاش کریں، فن کو اپنی ذات کے حوالے سے منوانے کی کوشش کرتی ہیں ،

ادب میں بھی یہی صورتِ حال ہے ۔ عورت، انکار اور شکایت کا ادب پیدا کرتی ہے، وہ فطرت میں اپنی روح کا پیکر تلاش کرتی ہے ۔ وہ ذاتی یادداشتوں، خطوط اور گفتگو میں دل کی بات کھول کر بیان کر دیتی ہے اور اپنی سوانح کو ناول کا روپ، اپنے جذبات کو نظم کا لحن دے کر وہ بہت مطمئن ہوتی ہے۔

عورتوں کی تخلیقی صلاحیتیں بھی عموماً حیض کے بند ہونے یعنی اضافی کاموں کے ختم ہونے کے بعد سنجیدگی سے شروع ہوتی ہیں۔ چونکہ پلوں کے نیچے سے کافی پانی گزر چکا ہوتا ہے اور عورت نے فن کو پامردی اور مستقل مزاجی سے شعارِ زیست نہیں بنایا ہوتا ہے۔ اس لئے انفرادیت برقرار نہیں رکھ سکتی ہے۔ اگر محنت اور لگن سے کام کرے تو کولیٹ بن جاتی ہے۔ جب محنت نہ کرنا اور سُستی کو حاوی رکھنا شعار ٹھہرا تو پھر ظاہر ہے کہ خود کو عوام میں منوانے کے لئے یا تو خوبصورتی کا سہارا لینا پڑتا ہے یا پھر کوئی اور اختراع یا حجاب کہ کچھ چھپوانا بھی نہیں اور محنت بھی نہیں کرنی۔

بدقسمتی یہ ہے کہ بے ساختگی اتنی آسانی سے حاصل بھی نہیں ہو جاتی جتنی کہ سمجھی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ نوآموز لکھنے والی جس خیال کو بالکل اچھوتا سمجھ رہی ہو، وہ اچھوتا نہ ہو بلکہ پرانے خیال کا توارد ہوا ہو۔ اگر کوئی اُسے یہ بتائے تو وہ بیزار ہو کر ممکن ہے۔ اپنا قلم اُٹھا کر پھینکدے۔ وہ یہ نہیں سمجھتی کہ لوگ آنکھوں سے پڑھتے ہیں اور یادوں کے خانوں میں محفوظ چیزیں ویسی ہی چیز دیکھ کر دوبارہ تازہ ہو جاتی ہیں۔ ہم کولیٹ[1] میں بے ساختگی کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں ایسی تحریر کسی مرد لکھنے والے کی بھی نہیں ہے۔ کولیٹ جو لکھتی ہے۔ اس میں سے کچھ حصّہ محفوظ رکھتی ہے۔ باقی ضائع کر دیتی ہے، جبکہ ایک نوآموز لکھنے والی ہر چیز کو اپنے جذباتی ردِ عمل کی صحیح عکاسی سمجھ کر محفوظ رکھتی ہے۔ یہی نرگسیت، ان لکھنے والیوں کو اعلیٰ پائے کی مصنفین بنانے میں حائل رہتی ہیں۔ اگر مسئلہ صرف شہرت حاصل کرنا۔ میری بشکر تسیو کی طرح کا ہو۔ یعنی وہ پینٹنگ کر کے خود کو منفرد اور مشہور بنانا چاہتی تھی۔ تو پھر یہ طریقِ کار درست ہو گا۔ چند خواتین لکھنے والیاں ہر وقت صرف اپنے بارے میں بات کرتی نظر آتی ہیں۔ ہم ڈرامے کی تنقید، لکھنے والی خاتون کے بارے میں

---

[1] فرانس کی مقبول ناول نگار

تفصیلات اور اس کے جسم کے خطوط کی دلآویزی اور بالوں کی رنگت کا تذکرہ پہلے پڑھتے ہیں اور تنقید بعد میں۔ اسی طرح جھوٹی سچی سوانح کہ جن میں بارہ مصالحے قسم کی باتیں ہوں، عورت کا ایک خاص قسم کے محبوب حصول کی کوشش میں بار بار، طرح طرح کے مردوں سے ملنا اور اس تگ و دو میں جنسی تجربات، یہ سب بیان ایک پری نامے کی طرح ہوتا ہے۔ جس میں اس کا وجود شاعرانہ دھند میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ فرار کی یہ ایک شکل ہے کہ عورت معاشرے میں اپنی غلط عکاسی کی بنا پر کبھی بربنائے احتجاج اور کبھی بربنائے تشنگی کرتی ہے کہ بنیادی طور پر اس کی تربیت بطور ایک بزدل کے ہوتی ہے۔ بزدل دوسرے کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ جب وہ لکھنے لگتی ہے تو بہت سوں کو وہ یوں ناراض کرے گی اور اس میں یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ صحیح لکھ کر بہت سوں کو ناراض کرے حالانکہ ایک منفرد مصنّف، حیران کرنے والا، لوگوں میں طرح طرح کی باتیں اُٹھانے والا اور باغیانہ خیالات کا مالک ہوتا ہے۔ عورت بطور مصنّف جب اس میدان میں داخل ہوتی ہے تو لوگ کبھی اُسے حیران ہو کر اور کبھی تعریف کے پالنے میں ڈال کر دیکھتے ہیں۔ خاتون بھی تحریر پہ کم اور اپنے اندازِ گفتگو، پیرہن اور مذاق پر زیادہ وقت صرف کرتی ہے اور جو لکھتی ہے وہ اُوپر بیان کیا گیا ہے، خوب بکتا ہے۔ مگر یہ وطیرہ کہ جو استحصال ہی کی دوسری شکل ہے۔ عورت مصنّف کا حتمی کردار نہیں بنتا ہے۔

اب جبکہ خود مختار عورت، اپنے جذبات کے انفرادی اظہار میں، یکتائی حاصل نہیں کر سکتی ہے اور جن مردوں کے خلاف وہ بغاوت کر رہی ہوتی ہے۔ بالواسطہ طور پر انہی کی گرفت میں وہ مقید ہوتی چلی جاتی ہے۔ سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ وہ مرد کے سماج میں زندہ ہیں اور اس کے لوازمات سے آزاد ہو کر نہیں لکھ سکتی ہیں۔ اسی لئے ان کا شعور محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہر چند بہت سی خاتون لکھنے والیاں اَب نرگسیت اور مصنوعی سحر سے گریز کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ رُوسا

سوسائٹی کی شاعرات بن کر، لوگوں کو دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ اچھی بیوی کے خصائص خوبصورت ڈرائنگ روموں کی سجاوٹ میں سجی سجائی خاتون اور مثالی خاتون کا زائچہ بحوالہ افسانہ، ناول، ڈرامہ اور شاعری پیش کیا جاتا ہے۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ، کنیڈا یا سکنڈے نیوین ملکوں کے ادب میں ان خصائص کا نمایاں ہونا، ہمارے کلیے کی توثیق کرتا ہے۔ ایسا لکھنے والی خواتین، معاشرے اور مردوں کو بری بھی نہیں لگتی ہیں اور خوب دولت اور شہرت کماتی ہے۔

سب سے دلچسپ وہ خاتون ہوتی ہے جو موجود روایت کو چیلنج کرتی اور سوسائٹی کے عدم انصاف کی دہائی دیتی ہے۔ احتجاجی ادب، موثر اور بھرپور ادبی منظر نامہ پیش کر سکتا ہے۔ ایلیٹ نے آخر وکٹورین برطانیہ کا نقشہ کھینچا تھا۔ ورجینا وولف، جین آسٹن، برونٹے سسٹرز نے عورت کا اصل کردار اور بوجھ ظاہر کرنے کو بے پناہ محنت کی۔ ایلیٹ نے تو عورتوں کا حوصلہ بڑھانے اور سچ بولنے کی ہمت کرنے کو اپنی قوت کو منفی طور پر استعمال بھی کر کے، عورتوں کو اپنا منفرد رنگ اور بے جھجک لکھنے کا حوصلہ بھی دیا۔ ہر چند درج بالا خواتین مصنفین میں دستوووسکی اور ٹالسٹائی والی عظمت تو نہیں آئی، پھر بھی کچھ زنجیریں تو ٹوٹیں آج کی عورت اسی لئے عورت کے وجود کے اعلان پہ محض نشانۂ تہمت نہیں رہتی۔ مگر حوصلے کی شاہراہ پہ آشنائی کم رکھنے کے باوصف حقیقت کے کنارے پہ آتے ہی اس کا سانس پھولنے لگتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خواتین کی لکھی بہت حوصلہ مند اور منفرد سوانحوں کے ہوتے ہوئے بھی۔ یہ یقینی امر ہے کہ یہ سوانح روسو کی سوانح " Confessions " اور سینڈال کی سوانح " Souvenirs'd egotisme " کے برابر نہیں آتی ہے۔ عورت، موجود اور روایت سے انکار کا بیڑا اٹھاتی ہے۔ مگر یہ انکار کا فلسفہ اسے ایک اور بھنور میں پھنسا کر اس کا ذہنی افق محدود کرتا ہے۔ اسی لئے عورت کو صرف ظاہری صورت سے آگے کے سفر

کی جانب روانہ ہونا چاہیئے ۔ ہوتا گیا ہے، عورت اکردار اور مقام کی تفاصیل تو خوب بیان کر دیتی ہے ۔ ولا کیتھر، ایڈیتھ وارٹن، ڈارتھی پارکر، کیتھرین مینس فیلڈ نے انفرادی منطقے تو پیدا کیے ہیں۔ لیکن وہ مرد ہیرو، ہیلتھ کلف کی طرح نام پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ وہ چیزوں میں رشتے تلاش کرنے کی بجائے صرف اشیاء کے اعلان کو زندگی اور ادب کہہ لیتی ہیں۔ وہ اشیاء میں مبہم توازن کو نہیں بلکہ ان لفظوں کو تلاش کرتی ہیں کہ جو حواس کو براہ راست متاثر کریں۔ فطرت کو عورت بڑے پیار سے بیان کرتی ہے۔

فطرت اور نوخیز لڑکی کے جسم کا بیان، ان کے نزدیک یکساں تشبیہہ ہیں۔ وہ خود اور اس کی نفی، سلطنت بھی اور گوشہ جلا وطنی بھی، اسی لیے جب ناول نگار خاتون باغ کا تذکرہ کرتی ہے تو یوں اپنے خوابوں کو لفظوں کا پیرہن دیتی ہے۔ اسی طرح گلدان، گملوں کے پودے وغیرہ بھی ان کے اسی طرح کے جذبات کے عکاس ہوتے ہیں۔ جو خواتین ان استعاروں سے بغاوت کرتی ہیں۔ وہ اپنے اُفق کو وسیع تر کرتی ہیں۔ ایملی برونٹے، ورجینیا وولف اور میری ویب روسو کے طرز پر، تحریر کو خارجیت سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ ایملی برونٹے نے موت سے سوال کیا ہے۔ ورجینیا وولف نے زندگی کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور کیتھرین مینسفیلڈ نے روزمرہ کے عذابوں کو داستان کہا ہے۔ عورت، دنیا کی موجودہ صورت کو ہدفِ ملامت و تنقید نہیں بناتی ہے، کیونکہ اُس نے تو ابھی دنیا کو برتنا سیکھنا شروع کیا ہے۔ وہ دنیا کو اتفاقیہ تسلیم نہیں کرتی، وہ اُس سے سوال بھی نہیں کرتی وہ اس کے تضاد کو بھی اُبھارتی بلکہ وہ تو اسے بڑی سنجیدہ حقیقت سمجھتی ہے۔ ویسے تو ہماری دنیا کے بیشتر اوسط مرد بھی دنیا کو اسی حوالے سے سمجھتے ہیں اور بہت کم مرد ہیں کہ جنہیں عظیم فنکار اور تخلیق کار کہا جا سکتا ہے۔

ادب، فلسفہ اور فنون، دراصل کوششیں ہیں، انسانی آزادی کے رشتے سے دنیا کو نئے سرے سے سمجھنے کی۔ ظاہر ہے کہ انسانی آزادی کے رشتے کو سمجھنے سے پہلے آزادی کے مفہوم سے آشنا ہونا بہت ضروری ہے۔ ہماری تعلیم اور سماج عورت پہ جو قیود عائد کرتا

ہے ، ان کے ہوتے ہوئے آزادی کے مفہوم کا صحیح تشخص ناممکن ہے۔ تو گویا عورت کو
سب سے پہلے موجود سماجی اور تعلیمی حد بندیوں کو خیرباد کہتے ہوئے آزادی کی جانب سفر
کرنا ہے۔ یہ باتیں میں یہ جانتے ہوئے کہہ رہی ہوں کہ ایک لڑکی گلی میں نکلتی ہے تو ہر آنکھ
عمر کی قید و بند سے آزاد ، اس کی جانب اٹھتی ہے ، اس کے ہر قدم اور ہر عمل کو سارا جہان
دیکھتا ہے اور عورت ان تمام حرکتوں سے شعوری طور پر آگاہ بھی ہوتی ہے۔ عورت چونکہ
قدرتی طور پر وحشیانہ طرزِ عمل سے ناآشنا ہوتی ہے۔ اس لئے بے عملی کی شکار دکھائی جاتی
ہے۔ ایک لڑکا کسی سے لڑتا ہے یا بات کرتا ہے تو کسی دوسرے کو سمجھانے یا بات ختم
کرنے کو درمیان میں نہیں لاتا ہے۔ مگر عورت کو افسانوی اور حقیقی دنیا میں ایسے چکروں میں گرفتار
دکھایا گیا ہے۔ اگر بدصورتی کا عذاب بھی سر پر ہو تو یہ عذاب ، بغاوت کرنے والی عورت
کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ یہ ایملی برونٹے کی تنہائی ہی تھی کہ جس نے اتنی تیز اور خوبصورت
کتاب لکھوائی۔ روزا لیکسمبرگ بدصورت تھی۔ وہ اپنے تصور کو بھی بدصورت سمجھتی تھی۔
وہ خود ہی دام تھی اور خود ہی صیاد اور یوں وہ تمام تر مجسم آزادی کا نشان تھی۔ معاشرے
میں وہی مرد بھی لائقِ افتخار ہوتے ہیں جو معاشرے کو اپنی ذمہ داری سمجھ لیتے ہیں۔
ابھی تک چونکہ کسی خاتون نے خود کو اس کا اہل نہ سمجھا ہے نہ ثابت کیا ہے۔ اس لئے
ذہین ترین افراد میں اپنا شمار نہیں کرا سکی ہے۔

کیا وان گو ، عورت تھی۔ ایک عورت کو کوئلے کی کان میں مشن پر یوں سراغ رسانی
اور سیکرٹ سروس کے لئے نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ وہ عورت ہوتی تو مزدوروں کے مصائب
پہ رو دھو کر بیٹھ رہتی اور ان زخموں کو دیکھ کر سورج مکھی کے پھول نہ بناتی۔ کوئی عورت
کافکا بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے شکوک اور پریشانیوں میں عادتاً گھری ، جنت سے
نکالے ہوئے انسان کے غم و غصے کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میرے خیال میں ثریا
کے علاوہ شاید ہی کوئی عورت ہو کر جو اپنے وجود کو فراموش کر کے ، انسانیت کے لئے

زندہ رہی ہو۔ عورت جب جنسیت کی حدود سے ماورا، اپنی ذاتی تاریخ، تشخص، انفرادیت اور کام کو حقیقت کے طور پر مانے گی۔ اسی وقت وہ ایک منفرد تخلیق کار بن سکے گی۔

ایک دفعہ پھر، عورت کی مجبوریوں اور کردار کو سمجھنے کے لئے واضح نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ زیادہ تر محققوں نے یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ عورت میں تخلیقی منتہا اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ مگر یہ کلیہ عدم تحرک نسواں کی قائد میڈم مارتھے بوریلی کی جانب سے دیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی کتاب کو انہی تضادات کے باعث، احمقانہ بنا دیا تھا۔ سیدھی بات تو یہ ہے کہ جب آپ ایک فرد کو اعلیٰ صلاحیتوں کے مظاہرے اور استعمال، دونوں کی اجازت نہیں دیتے۔ تو پھر اس سے اعلیٰ صلاحیتوں کے اعلان کی توقع کیسے کرتے ہیں۔

آزاد عورت، ابھی پیدا ہو رہی ہے کہ ابھی وہ اپنے وجود پہ اپنا تصرف حاصل کر رہی ہے۔ جب عورت پہ بے پناہ پابندیوں کی طناب ٹوٹے گی تو پھر شاعرات بھی پیدا ہوں گی۔ پھر وہ اپنے لئے، اپنی ذات کے لئے زندہ رہنا بھی سیکھے گی۔ وہ نامعلوم کی تلاش میں نکلے گی اور کامیاب ہوگی۔ اس کی تصوّراتی دنیا، ہم سے مختلف ہوگی۔ کس قدر مختلف ہوگی۔ یہ کہنا فی الوقت بعید از قیاس ہے۔ اس وقت تو صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُسے زندگی میں مواقع کا فائدہ اُٹھانے، اپنے اور معاشرے کی فلاح کے لئے آگے آنے کا موقع دیا جائے۔

اختتامیہ

"کوئی عورت، ہمارا بھائی نہیں ہے۔ تجربے اور تشکیک کے ذریعہ ہم نے اُسے اپنے سے الگ، نامعلوم وجود دیا ہے کہ جس کے پاس اپنے تشخص کے لئے سوائے جنس اور کچھ نہیں ہے۔ جس کا مطلب مسلسل تنازعہ بلکہ ناواجب تنازعہ ہے۔ اس کی تعریف کرنا یا عیب جوئی، مگر ایک سیدھے سچے دوست کی طرح نہیں۔ بلکہ ایک عمر بھر کے غلام کی طرح۔"

بہت سے مرد، لیفوریگ کے ان الفاظ کو آج بھی ایک امرِ واقعہ اور سچائی کی طرح مانتے ہیں۔ کچھ اشتباہ کے باوجود، یہ کہتے ہوئے کہ مساوات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا مرد یا عورت، ایک دوسرے سے مطمئن نہیں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی بنیادی اختلاف ہے جو ایک دوسرے سے دونوں کو منحرف کرتا ہے کہ یہ کوئی ایسا لمحہ ہے جو انسانی تاریخ میں عبوری لمحے کے نام سے تعبیر کیا جا

سکتا ہے۔

داستانیں کہ جن کا مابعد الطبیعاتی کوئی وجود نہیں۔ وہ عورت اور مرد کو ابدی دشمناگی کے حصار میں رکھتی ہیں۔ انسانیت، مرد اور عورت کے وجود کے اعلان سے سوا بھی کچھ ہے۔ یہ تاریخی ارتقا ہے۔ ہر چند اس ارتقا میں رقابت کو بالا اصول ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ رقابت نفسیات و بدن کے مابین، کوئی بھی منزل ہو سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت مرد کے عضوِ تناسل پہ رشک کرتی ہے۔ دراصل وہ اس وجود اور آزادی پہ رشک کرتی ہے۔ جو عضوِ تناسل کے حوالے سے معاشرے میں مرد کو حاصل ہے یہ رشک بھی دوغلہ ہوتا ہے۔ ایک طرف تو عضوِ تناسل حاصل کرنے کا خیال کہ جس کو وہ ایک لمحے میں لائقِ احترام سمجھتی ہے اور دوسرے لمحے وہ اس سے انکار کرتی ہے۔ ویسے بھی جنسیت باقاعدہ کلیہ کے طور پر، عورت اور مرد کی تسلیمیت کی بنیاد قرار نہیں پاتی ہے۔ وقت کی لامحدود مملکت میں ابدی عورت اور ابدی مرد کے درمیان تنازعہ جاری و ساری ہے۔ ہم یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ دونوں کی یہ آویزش، تاریخ کے دو مختلف لمحوں کی مختلف جہتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

مرد کے اصولوں پہ مرتب سماج میں، عورت ایک کمتر انسان ہے۔ عورت اس کمتری کو اسی طرح دور کر سکتی ہے کہ وہ مرد کے احساسِ برتری کو فنا کرے۔ وہ ایک جابر اور صاحب الرائے شخص سے اختلاف کرتی اور اُس کی بات کی نفی کرتی ہے۔ یوں کرتے ہوئے گویا وہ اپنا دفاع کر رہی ہوتی ہے۔ وہ اُس کی تردید کرتی ہے۔ اس کے سچ اور اس کی اخلاقیات کا مذاق اُڑاتی ہے۔ قدرت نے اُسے کمتر پیدا نہ کیا ہے۔ نہ ماحول ایسا بنایا ہے کہ اُسے کمتر سمجھا جائے بلکہ اُسے مجبور کیا گیا کہ وہ خود کو بھی کمتر سمجھے۔ اسی لئے جنگ کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ وجود کہ جسے غیر ضروری خیال کیا جائے۔ وہ بپھر کر اپنی انانیت کے بھرپور حصول کے لئے جست لگاتا ہے۔

آج یہ جبت، مختلف شکل اختیار کر رہی ہے۔ بجائے مرد کو زنداں میں رکھنے کے وہ اس سے فرار حاصل کر رہی ہے۔ وہ اس کو اپنے قریب لانے کے لیے نہیں بلکہ خود کو سماج میں بطور فرد سربلند کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اب مرد کا رویہ ایک نئے تضاد کو جنم دیتا ہے۔ مرد بڑی بے ہودگی سے عورت کو آگے جانے دیتا ہے۔ یعنی وہ اپنی حاکمیت کو برقرار رکھتے ہوئے، عورت کی مساوات کی خواہش کو پاؤں تلے روند دیتا ہے اور اس کی دوسراہت قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ مرد کے اس عدم یقین کے عمل کا جواب جارحیت سے دیتی ہے۔ اب یہ دو خانوں میں مقید، دو افراد کی لڑائی نہیں ہے۔ یہاں دونوں افراد، بالمشافہ ہوتے ہیں۔ بجائے ایک دوسرے پہ اعتماد و احترام کی فضا قائم کرنے کے۔ وہ دونوں آزاد افراد ایک دوسرے پہ حاکمیت قائم کرنا چاہتے ہیں یہی رویے کا اختلاف جسمانی یعنی جنسی سطح پر بھی اجاگر ہوتا ہے اور روحانی سطح پر بھی عورت کہ جو نسوانیت کا بہروپ بھرتی ہے، وہ مرد کو اس عدم عمل کی منزل پہ لانا چاہتی ہے۔ جس پہ مرد کبھی عورت کے ساتھ سلوک کیا کرتا تھا۔ وہ مرد کو اسی طرح ترغیب دلاتی اور ترساتی ہے۔ جس طرح مرد، عورت کے ساتھ کرتا رہا ہے۔ ایک آزاد اور باشعور خاتون، ان سارے تاملات کو رفع کرنا چاہتی ہے، جن کا جال مرد بچھاتا رہا ہے۔ جدید عورت، مرد کی خوبیوں کو تسلیم کرتی ہے۔ وہ ان کا سوچ کر خود میں فخر بھی محسوس کرتی ہے، مرد کی طرح کام کرتی ہے۔ اور اس کے برابر کا خود کو عملی طور پر ثابت کرتی ہے۔

ہاں چند خواتین جو انفرادی طور پر اس مساوات کے درجے پہ نہیں آسکتی ہیں۔ وہ جنسی سہارے پہ خود کو آگے بڑھاتی ہیں۔ وہ دونوں طرف چلتی ہیں۔ یعنی پچھلے زمانے کی سی عزت اور جدید زمانے کی آزادی، یعنی گزشتہ سحر اور جدید حق کے امتزاج کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی صورت میں مرد پریشان ہوجاتا ہے اور خود کو مدافعانہ مقام پر لے آتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی دُہرا کھیل، کھیل رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ناقابل اعتبار

عادت اور گستاخانہ رویّے سے، عورت کے ہر اقدام کی نفی کرتا ہے۔ اب عورت اپنی ذات اور دوسری عورتوں، دونوں کے وجود کا حساب لینا چاہتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ مرد محسوس کرتا ہے کہ اس کے ساتھ چال چلی جارہی ہے اور عورت سمجھتی ہے کہ اُسے غلط سمجھا جارہا ہے۔ یہ کشمکش اس وقت تک جاری رہے گی جب تک دونوں ایک دوسرے کے وجود کو بطور فرد، احترام کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ حاکمیت کا خواب، نہ عورت کا پورا ہو سکتا ہے اور نہ مرد کا، جب یہ صورت ہو تو دونوں ایک دوسرے کو اس بحران کا ذمہ دار اور خوشی کے مفقود ہونے کا الزام دیتے ہیں، مرد چاہتا ہے کہ وہ خود کو بیوی کے وجود میں تلاش کرے۔ اپنی خادمہ کی شکل میں محبوبہ کو دیکھے، پتھر کے زمانے کی شبیہہ کی طرح، وہ عورت کی شکل میں اپنی تربیت و تہذیب کی نمائندہ مگر قدامت پسند، روایتی عورت، حقیقت کی طرح حاصل کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ حالانکہ اس تصور میں مرد خود اپنے ہی تضاد کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ خود کو برتر ثابت کرنے کے لئے، اپنے اس تصور کو کہ جو مشکوک ہو یا خطرے میں ہو، برابر اُوپر ہی اُوپر چڑھاتا جاتا ہے، حالانکہ ہر صورت کے باوجود، اس کی آزادی، عورت کی آزادی سے بہرحال منسلک و متعلق ہوتی ہے۔ مرد خود کو برتر، اعلیٰ اور منفرد ثابت کرنے کے لئے اپنا ایک انداز بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس انداز کی تصدیق چاہتا ہے۔ اس کوشش میں وہ عورت سے خوفزدہ ہوجاتا ہے اور خوفزدگی کے اثر کے تحت وہ جارحیت اختیار کرتا ہے۔ اس جارحیت اور خوفزدگی کے جذبے کو وہ عورتوں کے بارے میں باتیں کرنے، ان کو پرچانے اور ان کی طرف راغب ہونے کی کوششوں میں منتقل کرتا ہے۔ گویا اس طرح عورت کو آزاد کرنے کی کوشش میں وہ خود آزاد ہونے کی منزل پہ آجاتا ہے، مگر اسی منزل سے تو وہ خوفزدہ ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ صوفیانہ طرزِ استدلال کے ذریعہ، عورت کو مقید رکھنے کے فلسفے کو دُہراتا رہتا ہے اور بہت سے مردوں نے یہ باور بھی کرلیا ہے کہ عورت کو یوں بیوقوف بنایا جاسکتا ہے۔

اس فلسفے کو واضح کرنے کے لئے۔ انہوں نے خود ہی کہنا شروع کیا "ہائے عورت ہونا بھی کیا بد قسمتی کی بات ہے۔ اس بد قسمتی کو پھر طرح بہ طرح زیر بحث لایا جاتا ہے۔ مگر عورت گارڈین نہیں ہو سکتی ہاں پروٹیکٹڈ یعنی محافظ ہو سکتی ہے۔ اس کو باہر کام نہ کرنے کی تلقین اس کے اپنے سکون اور عافیت کے لئے کی جاتی ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ گھرداری اور حمل کے بارے میں کیا کیا شاعرانہ گفتگو اور حصار قائم کئے جاتے ہیں اور اس کی آزادی کے تقابل میں اس کو نسوانیت کا گھونگھٹ عطا کیا جاتا ہے۔ بلزاک نے ایسی صورت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ عورت کو نام تو ملکہ دیا جاتا ہے اور درجہ اور برتاؤ غلام کا سا ہوتا ہے۔ بہت سے مرد بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو بہت مراعات حاصل ہیں۔ کچھ امریکی سوشیولوجسٹ بڑی سنجیدگی سے یہ بتاتے ہیں کہ نچلے درجے کے فوائد کیا ہیں۔ جیسے فرانس میں کہا جاتا ہے کہ کارکن بڑے فائدے میں رہتے ہیں کہ انہیں موقع بہ موقع اپنا آپ ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے حبشی کوڑے کھا کر بھی ہنستا رہتا ہے اور تیونسی عرب اپنے بھوکے مرتے بچے کو ایک مسکراہٹ سے خرید لیتے ہیں۔ چونکہ اُسے تکلیف دہ بوجھ سے الگ رکھا جاتا ہے اس لئے وہ "بہتر نصف" کہلائی جاتی ہے۔ مگر صدیوں سے یہی "نصف بہتر" کا تعلق گناہ کے مساوی سمجھا جاتا ہے اور یہی نصف بہتر نوحہ کناں ہے کہ مجھے صرف برابر کا سمجھو اور عزت دو۔ نصف بہتر کہہ کر، غلام رکھنے کی کوشش نہ کرو۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مرد، عورت میں زیادہ پیچیدگیاں پاتا ہے، بمقابل ایک جارح کے کہ جو جارحیت کے ذریعہ دوسروں کو دباتا ہے۔ عورت کی تربیت کی تمام گزرگاہیں ان موڑوں سے گریز کرتی ہیں کہ جن پر انقلاب یا ایڈونچر کا لوردبھیان ہوتا ہے۔ سوسائٹی، عمومی طور پر قابلِ احترام والدین سے شروع ہوتی ہے۔ پھر اس کے سامنے سب سے محبت کا چارٹر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ نظر میں رکھے بغیر کہ عورت کو

نہ عاشق، نہ محبوب، نہ شوہر اور نہ بچے جوابًا وہ محبت دے سکیں گے کہ جو عورت سے زندگی میں حاصل کریں گے کہ اُسے تو قربانی کا درس دے کر، محنت اور صبر کی آزمائش سے گزارے چلے جائیں گے۔ اگر کسی بچے کو علم کی افادیت اور اہمیت بچپن میں ذرا بھی نہ بتائی جائے۔ تو وہ بڑا ہو کر بھی جاہل ولا علم رہے گا۔ اسی طرح عورت کو سب کی خدمت کا درس دیا جاتا ہے، مگر کبھی اپنی ذات کا دھیان رکھنے کی ترغیب دینے والا کوئی ماں کا لال پیدا نہیں ہوا۔ عورت اپنی محبت، صحت پیار اور تحفظ کیلئے بھی دوسروں کی سمت دیکھنے اور متوقع رہنے کی عادی ہو چکی ہوئی ہوتی ہے۔ تمام تر تعصبات پیدا ہونے کی بھی وجہ یہی ہوتی ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی ان نتائج کی وجوہات کو ماننے اور اپنے سر الزام لینے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔ وہ مشکوک نظریہ کہ "غیر مساوی میں بھی مساوات" ہو کہ اس طرح عورت کی بزدلی اور مرد کی ناہموار قوتِ فیصلہ، متصادم نہیں بلکہ تجربے کی بھٹی میں، دونوں پگھل جاتے ہیں اور پھر "لینے" اور "دینے" کے محاورے جنم لیتے ہیں۔ عورت کہتی ہے۔ میں نے سب کچھ دے دیا اور مرد کہتا ہے کہ مجھے کیا ملا کہ عورت کی قیمت تو اس کا بے قیمت مل جانا ہے۔ مرد کے لئے عورت تو زندگی میں لطف پیدا کرنے کے لئے ہے اور مرد بلا جتائے اس کے تحفظ کی ذمہ داری اُٹھاتا ہے۔

وہ وقت جو میاں بیوی اکٹھے گزارتے ہیں۔ اس کی قیمت اور اہمیت دونوں کے نزدیک یکساں نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً جو شام وہ محبوبہ کے ساتھ گزار رہا ہے۔ وہی شام اپنے بزنس کو تقویت دینے کے لئے صرف کر سکتا تھا۔ دوستوں سے مل کر خوش ہو سکتا تھا اور اپنے بزنس ساتھیوں سے مل کر، مزید منصوبے بنا سکتا تھا۔ اسی لئے کئی دفعہ وہ فیصلہ کرتا ہے کہ صرف جنسی زندگی قبول، باقی وقت کا زیاں اور بیوی یا محبوبہ کے پاس وقت گزارنا، گویا اپنے مستقبل کو گنوانا ہے۔ عورت، اس سبزی فروش کی طرح

کہ جو آلو اس وقت بیچتا ہے کہ جب شلجم بھی ساتھ خریدے جائیں، محبوب سے کہتی اور کرتی ہے کہ جب تک وہ گھنٹوں اس کے ساتھ پیار محبت کی باتیں نہیں کرے گا۔ وہ بھی اپنا بدن اس کے سپرد نہیں کرے گی۔ مگر عورت کی یہ سوچ ملاپنے تئیں تشنہ ہی رہ جاتی ہے۔ پھر وہ اپنی طلب کی کمند اور نیچی کرتی ہے۔ مگر مصالحت، دگنی پریشانی پاکر ہوتی ہے کہ مرد کو ہمیشہ دوسرے کام کرنے یاد رہتے ہیں، جبکہ عورت کے پاس وقت کاٹے نہیں کٹتا ہے۔ مرد سمجھتا ہے کہ وہ عورت کو جو بھی وقت دے رہا ہے، وہ گویا تحفہ نہیں بلکہ ایک بوجھ ہے جو وہ اُتار رہا ہے۔ اس لئے وہ یہ بوجھ اُتارتے ہوئے بھی بڑے استغنا کی کیفیت میں رہتا ہے۔ عورت کو جب اپنی کیفیت ایک گداگر کی سی معلوم ہوتی ہے تو وہ اور بھی آزردہ خاطر ہوتی ہے۔

عورت، صورتِ حال کو سمجھ کر جو ظلم کرتی ہے۔ اس میں وہ خود کو حق بجانب سمجھتی ہے۔ وہ مرد کی تشنگی سے لذت گیر ہو کر، آسودہ خاطر ہوتی ہے۔ مرد اس کو الزام دیتا ہے اور یوں دونوں میں کھینچاؤ کا عالم اور تیز ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ناانصافیوں کے میدان میں انصاف کا علم بلند نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایک دساور سے آیا ہوا آمر، مقامی لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش نہیں آسکتا ہے۔ مسئلہ پھر مقامی یا دساور کا ہونے کا عورت کے معاملے میں نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ مرد بہر حال مرد ہوتا ہے اور آپ اس کے قدرتی اور فطری ردِ عمل کو روک نہیں سکتے ہیں۔ اگر کوئی مرد، کسی عورت سے محبت یا لگاؤ محسوس نہیں کرتا ہے، البتہ اُس کی مالی نگہداشت کرنے پہ مجبور ہے۔ تو وہ بھی خود کو استحصال کا شکار محسوس کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اس عورت کو چھوڑ دیتا کہ جو ساری زندگی ایک مرد پہ قناعت کرکے اور اس کے مالی معاونت پہ انحصار کر رہی ہوتی ہے تو یہ عمل بھی ظلم کے مترادف ہو گا۔ عمل کا منفی رجحان اس وقت ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ دونوں ایک دوسرے کو الزام دینا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ

اگر جاری رہے تو جونک کی طرح وہ ایک دوسرے کی صلاحیتوں کو صلب کر لیتے ہیں۔

اگر ان میں زندہ رہنے کی قوت ان کی انفرادیت کی بنیاد پر موجود ہو تو مرد اور عورت اس نئی صورتِ حال سے خود میں زیادہ تقویت محسوس کریں گے۔ یہ ایسی ہی صورتِ حال ہوگی کہ جس کا روسی انقلاب نے وعدہ کیا تھا۔ روس مین عورت اور مرد کو یکساں محنت، تربیت اور پھر مساوی اُجرت ملنے لگی۔ عشق کی آزادی، تہذیب اور رسوم کا حصّہ قرار پائی۔ ہاں جنسی عمل کو محنت بلا معاوضہ میں شمار نہیں کیا گیا۔ بلکہ دونوں فریق آزادانہ اور مساوی فیصلے سے ایک دوسرے کو قبول کرنے اور ضرورت پڑنے پر آزادانہ ختم کر دینے کی قوت رکھتے ہوئے، حمل بھی رضاکارانہ اور مانع حمل ادویات کا استعمال بھی رضاکارانہ، بچے پیدا ہوتے ہی پرورش کے لئے حکومت کی ذمّہ داری، ماں باپ سے اولاد چھین کر۔ بلکہ ان کی اعانت سے خاندانی بہبود کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔

مگر کیا قانون کے بدلنے سے، سماج، نقطۂ نظر، انسان اور اس کے رسوم و رواج بدل جاتے ہیں اور کیا مرد، عورت واقعی مساوی انسان بن جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اوّل عورت تو بہر حال عورت ہی رہے گی۔ اگر وہ اپنی نسوانیت کی نقاب اُتار بھی پھینکے تو پھر وہ مرد جیسی نہیں بلکہ جن بن کر نمودار ہوگی۔ یہ اعلان بھی اس لئے ہوگا کہ آج کی عورت کو قدرت کی تخلیق مانا جائے۔ یہاں اس بات کے اعادے کی ضرورت ہے کہ انسانی سماج میں کوئی چیز قدرتی نہیں ہوتی ہے اور عورت بھی دوسروں کی طرح تہذیب کے جلو میں پرورش پاتی ہے۔ اس کی تقدیر و وجود میں دخل دینا، دوسروں کا بنیادی فریضہ بنتا ہے۔ اگر یہ عمل مختلف جہت میں ہوگا تو اس کے نتائج بھی مختلف ہوں گے۔ عورت کے فیصلے، اس کے ہارمونز یا سربستہ حیات سے منتج نہیں ہوتے بلکہ اس کے علاوہ دیگر افراد کے ساتھ اس کے ذہنی روابط قائم ہوتے ہیں اور اس کے جسم پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ نوبالغ لڑکے اور

لڑکی کے مابین فاصلوں کو بچپن ہی سے واضح طور پر ممیز کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بنیادی تربیت کے بعد مستقبل میں اس کا اثر ہوگا اور عورت دبی ہوگی کہ جو اُسے بنایا جائے گا۔ اگر ہم ان اثرات کو سمجھ رہے ہیں تو پھر ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ عورت کا یہ ردِ عمل، بدی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ صرف معاشی پہلو ہی ہے کہ جو اس کی تقدیر اور اس سے متعلق رویوں کو بدل سکتا ہے۔ بلکہ جب تک اخلاقی، سماجی، تہذیبی اور دیگر رویئے کہ معاشرہ جن کا وعدہ کرتا اور جن پر چلتا ہے، اگر نہیں بدلتے، نئی عورت کا وجود ناممکن ہوگا چاہے وہ روس ہو۔ فرانس، یا امریکہ ہو۔ وہ صحیح عورت بننے کیلئے مرد کے روپ میں سماجی طور پر ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہاں بھی اتنی ہی بے چین ہوتی ہے جتنی بے چین وہ عورت کے وجود میں ہوتی ہے۔ یہاں صرف سماجی انقلاب ہی اُس کو اُن بے چینیوں سے نجات دلا سکتا ہے۔ جب تک عورت مرد میں مساوات قائم نہیں ہوتی۔ اس وقت تک فرد کی انفرادیت کا کلیہ، عورت کے لئے استعمال نہ ہو سکے گا۔

اگر چھوٹی بچی کو بچے کی طرح کھلونے، تربیت، کورس اور تعلیم دی جائے، اس کے سامنے مرد عورت برابر کی بنیاد پر ملیں۔ ماں باپ اخلاقی اور مالی۔ دونوں ذمہ داریاں برابر کی اُٹھائیں اور برابر کی عزت کے حقدار ہوں۔ تو نہ تو عورت بیکار رہنے پہ مصر رہے گی۔ نہ صرف باپ کی محبت اس کا محور رہے گی۔ بلکہ وہ کھیل اور محنت، دونوں میدانوں میں برابری کی بنیاد پر لڑکوں سے مقابلہ کرے گی اور اس میں خوابناک تخیلات کی جگہ حقائق کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گا۔ وہ اپنی قسمت کو خدا کا لکھا ہی نہیں سمجھے گی۔ بلکہ خود کام کرے گی۔ بلکہ بے محابا کام کرنے کی جانب مائل ہو گی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ اگر لڑکے لڑکی کی آزادانہ تربیت ہو تو بلوغت کی

سن ناہبٹ بھی، معقولیت کا رنگ اختیار کر سکتی ہے۔ حیض شروع ہونے سے
خوفزدگی لاعلمی کے باعث ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر دیگر جنسی تعلیم بھی میسر ہو تو نہ کم خوبصورتی
ہو گی نہ مرد سے خوف ہو گا نہ عورت پہ خود کو بے چارہ سمجھنے کا دورہ پڑے گا۔ بلکہ مرد کو
مقابلے پہ برابر کا انسان سمجھ کر، کام کرنے اور محنت کا جذبہ فروغ پائے گا۔

ایسے سماج کے بنانے میں رکاوٹ ہمارے سماجی، عوامل اور جنسی قیود کی پیدا کردہ
ہوتی ہے چھوٹے بچے میں جنسی تجسّس اور لذت کو ختم کرنے کی کوشش بے سود ہو گی
ہاں البتہ اس میں ذہنی دباؤ، جبر اور نوروسز ضرور پیدا ہو گا۔ ضرورت سے زیادہ
جذباتیت، ہم جنسیت کا اثر اور نوبالغ لڑکی سے صرف روحانی محبت کرنے کی تربیت
بہر حال، اس صورتِ حال سے کم نقصان دہ ہوتی ہے کہ جس میں بچگانہ جنسی کھیل اور
کچھ باقاعدہ جنسی تجربات ہی زندگی کا ماحصل بنتے ہیں۔ اس تربیت کے بعد عشق اور جنسی رغبت
اپنے قدرتی مگر آزادانہ رویوں کی سند بن کر، لڑکی کی زندگی کا حصہ بنتے ہیں۔ یہاں
بچے اور بالغ کے مابین زینہ بہ زینہ فرق کو معدوم کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہے۔

ماہرین نفسیات نے بھی لڑکے اور لڑکی کے مابین سماجی اور جنسی فرق کو ختم کرنے کے لئے
والدین کو ہدایت نامہ دیا ہے۔ مگر اس پر عمل بھی اس قدر ناکافی اور اس تبدیلی کے خلاف
بیان کردہ جوازات کو اس قدر ہوا دی گئی ہے کہ یہ کوشش ابھی ابتدائی منازل ہی میں ہے۔

عورت گویا سربستہ جانکاہی کا شکار ہوتی ہے۔ جو خصوصیات اس کے لئے
روا رکھی جاتی ہیں۔ ان کا برقرار رکھنا گویا عورت کہلانے کے لئے لازمی ہے۔ مستقبل
میں ان پابندیوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ عورت اپنی حیاتی سطح پر،
مرد کی حاکمیت اور برتری سے نفرت کرتی ہے۔ مگر کیوں نہ ایسے ماحول اور سماج کو بھی

ختم کر دیا جائے کہ جو مرد کو حاکمیت اور عورت کو محکومیت کی اخلاقیات میں پرو تا ہے، آج کی بہت سی عورتیں جو آزاد اور معاشی طور پر مستحکم ہیں اور خود کو آزاد فرد متصور بھی کرتی ہیں۔ وہ آج بھی اپنی جنسی زندگی کو روایتی غلامی کا عکس ہی سمجھتی ہیں کہ مرد کے نیچے لیٹنا، مرد کا دخول، یہ ساری باتیں ان کو تشنج کا شکار اور یخ بستگی کا شکار بنا دیتی ہیں۔ ہاں اگر حقیقتِ احوال بدل جائے تو یہ مساوی سوچ اور یہ سارے تجزیے بدل سکتے ہیں اور یہی جنسی عمل جو فتح و شکست کے منظر و پس منظر کے بیچ کھڑا ہے باہمی اعتماد کی فضا اور لطف کا استعارہ بن سکتا ہے۔

مرد بھی عورت کی طرح گوشت پوست اور خواہشات کا آئینہ ہوتا ہے۔ بجائے اس کے ایک دوسرے کا لحاظ کر کے، تعاون کی فضا قائم کی جائے۔ عیب جوئی سے زندگی رقم کرتے ہیں۔ حالانکہ عام آدمیوں کے سے رویئے اور ادب سیکھ کر زیادہ پُر لطف زندگی گزر سکتی ہیں۔ بہ نسبت بڑے اور مہذب اپنے آپ کو بجھ کر۔ دوسرے کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کے۔

کچھ لوگ کہیں گے کہ سب سوچیں افلاطونی باتیں ہیں کہ نہ معاشرہ اس حد تک بدلے گا کہ عورت مرد بالکل مساوی درجہ حاصل کر لیں اور نہ یہ تصورات کہ جن کی اُمید بیان کی گئی ہے۔ واقعی حیثیت اختیار کر سکیں گی۔ قدامت پرستوں نے تو اسے ایک ناممکن الحل دائرہ کہا ہے۔ البتہ تاریخ اس طرح، دائروں میں نہیں چلتی ہے۔ اگر کسی ذات کو کمتری کے حصار میں رکھا جائے، ہر چند وہ کمتر رہتا ہے۔ مگر آزادی اس دائرے کو توڑ دیتی ہے۔ حبشیوں کو ووٹ دینے کا حق ہے تو وہ خود بخود ذمہ داری اُٹھانے کی حقدار، خود کو ثابت کر دے گی۔ مظلوم، ایک دم تو جبر سے نجات حاصل نہیں کرتا۔ البتہ اس کا ارتقائی طریق کار بھی حالات کی تبدیلی لئے کارفرما ہوتا ہے۔ جبر ضرورت اور حالات کو دیکھتے ہوتے، مرد کو بھی عورت کو تھوڑی سی آزادی دینی پڑتی

ہے۔ یعنی عورت، مرد کی بخشش بس قبول کرنے کی عادت ڈالے۔ یہ آغاز۔ البتہ اس انجام کی نشاندہی ضرور کرتا ہے۔ جو معاشی اور معاشرتی مساوات کا پیش خیمہ بن سکے۔
یہاں کچھ لوگ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اگر ایسی دنیا ممکن بھی ہو تو وہ دنیا رہنے کے قابل نہیں ہوگی کہ عورت، مرد میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ یوں تو زندگی کا سارا لطف اور طلسم ختم ہو کر رہ جائے۔ اس جواز کی بھی منطق کوئی نہیں کہ جو لوگ موجود انحطاط کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ نہ ماضی کی دھجیاں ان کے ہاتھ آتی ہیں اور مستقبل کی کوئی مسکراہٹ۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تصورات کی کمی ہی مستقبل کو دھندلا کرتی ہے۔ مگر کل آنے والی انسانیت، وہ اپنے وجود اور اپنی انسانی آزادی کے ساتھ سانس لے گی۔ وہ وقت اس کے لئے تحفہ ہوگا اور انسانیت اس تحفے کو قبول بھی کرے گی۔ دونوں جنسوں میں سمجھوتوں، تعلقات اور باہمی افہام و تفہیم کا وہ اُفق ہویدا ہوگا کہ ہم جس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم نے عورت اور مرد کے مابین دوستی، دشمنی، رقابت، الجھنیں، معاونت کہ جس میں افلاطونیت بھی تھی اور حسیت بھی، خوب دیکھی ہے۔ نئی دنیا کے بارے میں ایک ہی جواز دیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایسی دنیا بہت بور ہوگی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجود دنیا کی منافقتوں اور ناہمواری میں بوریت نہیں ہے؟

ابتدا میں، عورت اور مرد میں یقیناً فرق ہوگا۔ اس کا عشق، اس کی جنسی دنیا، اپنے آپ میں مختلف شکل اختیار کرتی ہیں اور وہ بہرحال ایک خاص قسم کے محسوسات، عوامل اور ردِ عمل کو قبول، اختیار اور انکار کرنے کے قدرتی عمل اور مظاہرہ کریں گی۔ یعنی لڑکی اور لڑکے میں جسمانی ساخت کا فرق، بہرحال ذہنی فرق کو دور جا کر ہی سہی، مگر واضح تو کرے گا۔ یہاں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مساوات میں بھی غیر مساویانہ اندازِ نظر خود بخود در آتا ہے۔ یعنی ایک ہی کلاس میں چاہے لڑکے ہوں یا لڑکیاں، خوبصورت بدصورت، ذہین، بدھو۔ بڑے گھر کے یا چھوٹے گھر کے۔ یعنی یہ تفریق بے معنی ہوتی ہے

جس طرح کوئی ایک پتہ بھی دوسرے پتے جیسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح عورت، مرد، بطور انسان اگر جینا سیکھ لیں تو پھر عورت مرد کی بانہوں کو استحصال کی کڑیاں نہیں سمجھے گی۔

یہ بالکل غلط ہے کہ اگر عورت مرد یکساں رویئے اختیار کریں تو ہر قسم کی جذباتی زندگی رقابت، حیثیت وغیرہ معدوم ہو جائیں گی۔ حالانکہ جذباتی مساوات اور ہم آہنگی ان کے اندر خواہشوں کے سوتے، جذباتی تعلق کی رمق، خوابوں کے حوالے سے مستقبل کے تصورات اور دنیا کے بدلتے معانی، اپنی کشش برقرار رکھے ہوتے ہیں۔ مزید برآں کہ جب دنیا کی آدھی آبادی کی غلامی کی زنجیریں کاٹ دی جائیں تو تقسیم سے ورا انسانیت، بھرپور طریقے پر پھلے پھولے گی اور انسانی جوڑے صحیح قسم کی خوشی حاصل کر سکیں گے۔ جیسا کہ مارکس نے کہا تھا کہ انسان کا انسان سے سلوک ہی، عورت مرد کے مابین عزت و مساوات کا علمبردار بنتا ہے۔ اس طرح یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کا کونسا فطری عمل انسانی ہو گیا ہے اور کونسا انسانی ذی روح، فطری ذی روح بن گیا ہے۔ یعنی کس حد تک اس کی انسانی فطرت، اس کی فطرت بن سکی ہے۔

اب یہ قصہ تمام ہوتا ہے کہ اب مردوں کے ہاتھ میں ہے کہ موجودہ دنیا کے درمیان، آزادی کا دور دورہ کریں۔ کامیابی کی منتہا حاصل کرنے کے لئے، یہ اس لئے ضروری ہے کہ قدرتی اور لازمی امتیازات اور فرق کے باعث، عورت اور مرد بلا تخصیص برادرانہ اخوت کے مضبوط رشتے میں پروئے جا سکتے ہیں۔

”عورت کیا ہے؟“

مغرب ہو کہ مشرق، یہی سوال ہر طرف موجزن۔ عُریانی ہو تو عورت سے منسوب۔ فحاشی ہو تو سبب عورت۔ بے حیائی ہو تو عورت کا تجزیہ کبھی کہا گیا ”اسنے جنّت سے آدم کو نکلوایا“ کبھی یہ اعلان کہ ”آدم کی پسلی سے عورت نکلی ہے“۔ گویا مرد کا وجُود منطقی، عورت کا وجُود مشروط، سماجی رشتہ اپنی ذات یا اپنے وجُود سے نہیں۔ مرد کے حوالے سے مُرتّب ہوتے سماجی رُتبے اور رشتے سے ممکن ہے۔

”عورت کیا ہے؟“

اس سوال کے جسمانی، نفسیاتی اور سماجی رشتوں کے حوالے سے

سیمون ڈی بوار نے اپنی کتاب The Second Sex میں اُٹھایا اور منطق کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے یہ تجزیہ کیا کہ عورت کو پیدا ہوتے ہی کونسا ماحول ملتا ہے۔ کونسے عوامل اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عورت کے بدن میں مدّ و جزر، کس طرح اس کے ذہنی افق کو تبدیل کرتا ہے اور کون سی معلومات نہ ہونے کے باعث، عورت یخ بستگی، ہسٹریا، نا آسودگی اور دیگر نفسیاتی امراض کا شکار ہوتی ہے۔

کشور ناہید نے ترجمہ کرتے ہوئے مشرقی سماج کی جکڑبندیوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔

یہ کتاب ہر مرد کو اپنے گھر کی کہانی اور
ہر عورت کو آپ بیتی معلوم ہوگی۔

قیمت : پچاس روپے